فروری تا مارچ تا اپریل 1960
المنار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ

(قرآن کریم سورۃ اعراف)

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

علم و عمل

نگران

شیخ محبوب عالم خالد ایم اے

مدیر اعلیٰ

لطف الرحمن محمود

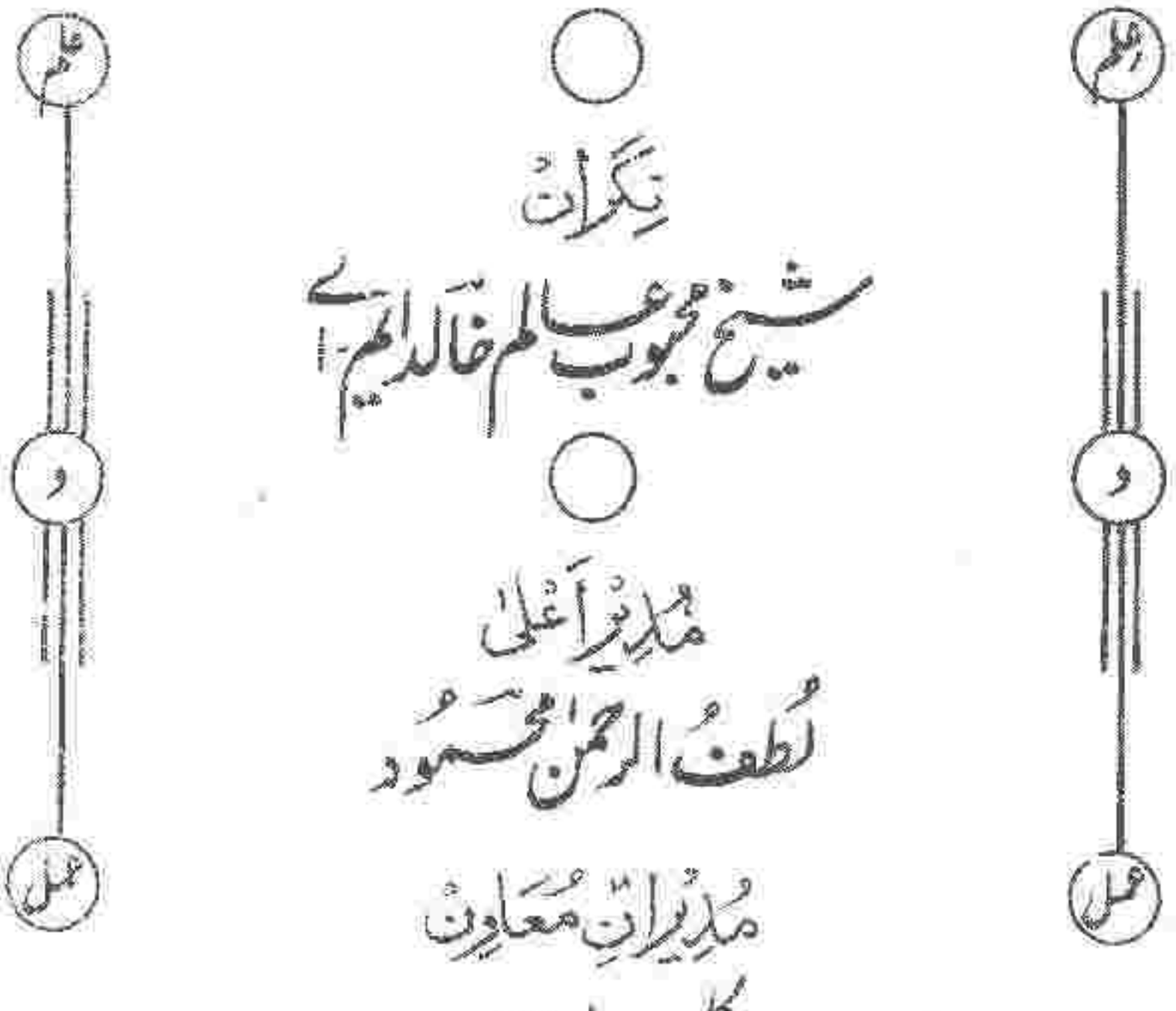

مدیران معاون

کلیم اللہ خان

مرزا محمد الیاس

جلد ۹ —— فروری، مارچ سنہ ۱۹۶۰ء —— شمارہ ۳، ۴

ترتیب

مستقل کالم

- تبرکات ——— حضرت بانی جماعت احمدیہ علیہ السلام
- بہ سبیلِ تذکرہ ——— ایڈیٹر
- نقد و نظر ——— سیلانی
- اظہارِ خیال ——— قارئین

افکارِ عالیہ

——— پروفیسر چوہدری محمد علی ایم۔اے
——— پروفیسر نصیر احمد خان ایم۔ایس سی
——— پروفیسر چوہدری محمد شریف خالد ایم۔اے۔ایل ایل بی

سوزِ دروں (غزلیں)

——— • خلیل رامپوری ——— • لطف الرحمٰن محمود ——— • محمد اقبال اختر ———
• منور احمد ساعر ———

بربطِ احساس (نظمیں)

——— • کلیم اللہ خان ——— • سمیع اللہ قریشی ایم۔اے ———

ذکر و فکر

مقالات

ادب: پیدائش اور مقاصد ——— لطیف احمد قریشی
اقبال کی شاعری میں مناظرِ فطرت ——— مرزا محمد الیاس

طنز و مزاح

- "مقررین کی قسمیں" ——— ایل۔ایم احمد
- بزمِ ابلیس ——— فاروق احمد
- "کب ایسے لوگ ہوتے ہیں پیدا جہاں میں" ——— حنیف صدیقی
- رنگریزے ——— محمد نعیم نیّر

چھاں دیاں چھلاں (پنجابی) ———

- غزل ——— منظور احمد شاکر
- غزل ——— لطف الرحمٰن محمود
- کہانی ——— منظور احمد شاکر

کہانی

کناروں کے ساتھ ساتھ ——— اختر وہاب

انتقاد

تبصرہ ——— ادارہ

پرنٹر پبلشر: جمشید ہاشمی ☆ مطبع: ضیاء الاسلام ربوہ

تبرکات

کَلَامُ الْاِمَامِ اِمَامُ الْکَلَام

لَا شَکَّ اَنَّ مُحَمَّدًا شَمْسُ الْھُدٰی

(از حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام)

وَاِنَّ اِمَامِیْ سَیِّدُ الرُّسْلِ اَحْمَدُ
رَضِیْنَاہُ مَتْبُوْعًا وَّ رَبِّیْ یَنْظُرُ

وَلَا شَکَّ اَنَّ مُحَمَّدًا شَمْسُ الْھُدٰی
اِلَیْہِ رَغِبْنَا مُؤْمِنِیْنَ فَنَشْکُرُ

لَہٗ دَرَجَاتٌ فَوْقَ کُلِّ مَدَارِجٍ
لَہٗ لَمَعَاتٌ لَا یَلِیْھَا تَصَوُّرُ

اَبَعْدَ نَبِیِّ اللّٰہِ شَیْءٌ یَرُوْقُنِیْ
اَبَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَجْہٌ مُّنَوَّرُ

عَلَیْکَ سَلَامُ اللّٰہِ یَا مَرْجِعَ الْوَرٰی
لِکُلِّ ظَلَامٍ نُوْرُ وَجْھِکَ نَیِّرُ

وَیَحْمَدُکَ اللّٰہُ الْوَحِیْدُ وَجُنْدُہٗ
وَیُثْنِیْ عَلَیْکَ الصُّبْحُ اِذْ ھُوَ یَحْشُرُ

مَدَحْتُ اِمَامَ الْاَنْبِیَاءِ وَاِنَّہٗ
لَاَرْفَعُ مِنْ مَّدْحِیْ وَاَعْلٰی وَاَکْبَرُ

دَعُوْا کُلَّ فَخْرٍ لِّلنَّبِیِّ مُحَمَّدٍ
اَمَامَ جَلَالَۃِ شَانِہِ الشَّمْسُ اَحْقَرُ

وَوَاللّٰہِ اِنِّیْ قَدْ تَبِعْتُ مُحَمَّدًا
وَفِیْ کُلِّ اٰنٍ مِّنْ سَنَاہُ اُنَوَّرُ

وَفَوَّضَنِیْ رَبِّیْ اِلٰی رَوْضِ فَیْضِہٖ
وَاِنِّیْ بِہٖ اَجْنِی الْجَنٰی وَاُنَضَّرُ

میرا پیشوا سید الرسل احمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ہم نے اس کو متبوع پسند کر لیا ہے اور میرا رب شاہد ہے۔

اور بے شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت کے آفتاب ہیں۔ اسی کی طرف ہم نے مومن ہو کر رُخ کیا اور شکر کرتے ہیں۔

آپؐ کو تمام درجات سے بلند درجات حاصل ہیں۔ آپؐ کے ایسے انوار ہیں کہ انسانی تصوّر ان تک نہیں پہنچ سکتا۔

کیا آنحضرتؐ کو چھوڑ کر کوئی چیز مجھے خوبصورت لگ سکتی ہے کیا رسول کریمؐ کے بعد کوئی اور ایسا منوّر چہرہ ہو سکتا ہے؟

تجھ پر خدا کا سلام ہو اے مرجعِ خلائق۔ ہر ایک اندھیرے کے لئے آپؐ کا چہرہ سورج ہے۔

خدائے یگانہ آپؐ کی تعریف کرتا ہے اور اس کا لشکر بھی اور صبح بھی حضورؐ کی ثنا کرتی ہے جب وہ لوگوں کو اکٹھا کرتی ہے۔

مَیں نے تمام انبیاء کے امام کی تعریف کی لیکن وہ میری تعریف سے ارفع و اعلیٰ اور اکبر ہے۔

ہر قسم کے فخر کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہی چھوڑ دو۔ آپؐ کی جلالتِ شان کے آگے سورج بھی بالکل حقیر ہے۔

اور اللہ کی قسم مَیں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی ہے۔ اور ہر وقت آپؐ کی روشنی سے ہی مَیں نور پاتا ہوں۔

اور میرے رب نے مجھے آپؐ کے فیض کے باغوں کے سپرد کر دیا ہے اور مَیں آپؐ کے ذریعہ سے ہی پھل چنتا اور تازگی پاتا ہوں۔

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

اداریہ

پہلے پہل تذکرہ

"المنار" کا تازہ شمارہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ "یہ کیسا ہے اور کہاں تک کامیاب ہے؟" — اس کا فیصلہ آپ خود ہی کریں گے۔ لیکن یہ کن حوصلہ شکن مراحل سے گزر کر آپ کے پاس پہنچا ہے؟ — ایک دل دوز کہانی ہے جسے ممکن ہے میں نہ کہہ سکوں ع

یہ داستانِ محبت طویل ہے ساقی !!

عام حالات میں جب کہ "امتحان" کا بھوت طلبہ کے سامنے نہیں ہوتا، ان میں ایک قسم کے تخلیقی جنون کی برقی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ اپنے سجے یا دو مدد گار رسالے کے لئے کچھ نہ کچھ لکھنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں — لیکن اس "فارغ البالی" کے دور میں بھی المنار کو قلمی بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور ابھی خاصی تگ و دو کے بعد — یہ شکستہ ناؤ — بے التفاتی کے بے رحم تھپیڑے سہنے کے بعد — سکوت کے اتھاہ سمندر کا سینہ چیر کر منصۂ شہود پر ابھرتی ہے !!

اب جب کہ امتحان کا افسردہ دور اپنی تمام پژمردگی کے ساتھ قریب آچکا ہے — طلبہ میں ایک خوفناک اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ اُن کے تابندہ اذہان کی پگڈنڈیوں پر اسی تفکر کی خزاں آلود گرد جم چکی ہے — اور تو اور المنار کے بعض نڈر کرم فرماؤں کے اعصاب بھی اسی خوف سے متاثر ہوئے ہیں !!

ان نامساعد حالات میں المنار کو جس قلمی بحران سے نبرد آزما ہونا پڑا ہے اس کی سنگینی یقیناً جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی ! لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے ادارے کے ناتواں قدم نہیں ڈگمگائے —

مجموعی طور پر حالات کی نامساعدت ہر قدم پر حائل ہوئی ! ہماری نحیف آواز اس نقار خانے میں کئی مرتبہ گونجی مگر پردۂ گوش سے ٹکرائے بغیر فضائے بسیط میں تحلیل ہو گئی ! نوٹس بورڈز پر کئی بار اعلانات چسپاں کئے گئے مگر بہت تھوڑی آنکھوں میں رحم آتا۔ اپنے آپ کو سقراط اور افلاطون سمجھنے والوں کے سامنے بھی ہاتھ پھیلائے گئے — مگر وہ "پتھر کے صنم" خاموش رہے۔ کتابی کیڑوں کو بھی جھنجھوڑا

گیا مگر ایک دل کی دھڑکن بھی نہ ہو سکی ـــــ المنار کا گشکول تو کاشانوں تک پہنچا مگر اس کے ٹکڑے نوٹ کر ہمارے دامن تک نہ پہنچ سکے !! طلبہ کے افسوسناک جمود کا پہاڑ ـــــ نقادوں کی "ریڈی میڈ" تنقید کی خندق ـــــ اور انتظامی مجبوری کی وسیع خلیج نے بڑھ کر ہمارا راستہ روکا ! اس قسم کے "ادبی قحط" اور "قلمی بحران" کے روح فرسا ماحول میں ہم نے المنار کے اوراقِ پریشاں کو بہم کرنے کی جرأت کی ہے۔ طلبہ کے رسالہ میں کمزوری کا عنصر لازمی جزو ہوا کرتا ہے۔ اس ناپختگی کا اعتراف ہم ہمیشہ ہی کرتے رہے ہیں۔ اس مرثیہ کو اس بات کے اعلان کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ اُن ناتجربہ کار طلبہ کا رسالہ ہے جو امتحان کے عمیق غار کے دہانے پر کھڑے ہیں ـــــ جن کی آنکھوں کے سامنے ایک "صحت مند" گدھے کے بوجھ کے برابر خشک و تدریسی کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ جن کے ہاتھ نصاب کے خاردار تاروں سے الجھے ہوئے ہیں ـــــ جن کے اعصاب اسی خوف سے مضمحل ہو چکے ہیں ـــــ بقول ہمدم جن کی

زندہ دلی کو کثرتِ افکار کھا گئی !

یہ اُن مجبور اور معذور طلبہ کا رسالہ ہے !! یہ مدنظر رکھ کر اگر نقاد کی متجسس نگاہ المنار کو دیکھے تو شاید اس کی علمیت کا حسین طلسم احساسِ مطلعیت کی ٹھوکر سے پاش پاش ہونے سے بچ جائے۔!!

چونکہ یہ شمارہ میرے عہدِ ادارت کی آخری پیشکش ہے اور مسائل کے علاوہ ذہنی اور قلبی طور پر مجھے دائمی فرقت کا احساس بھی بُری طرح ستا رہا ہے ـــــ مجھے المنار سے محبت ہے۔ میں نے المنار سے وابستہ ہو کر بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ پایا۔ اس "گناہ" میں بسر ہونے والے ناقابلِ فراموش ایام کی حسین یاد میری مجروح رُوح کو آخری دم تک گداز کرتی رہے گی ـــــ !!

یہ شمارہ ـــــ اپنی تمام معنوی اور صوری کمزوریوں کے باوجود مجھے تو اس لئے عزیز ہے کہ یہ کوئے حبیب کی معطر فضا میں میرا آخری سانس ہے ـــــ یہ کالج کے سنگِ در پر میرے پُرخلوص سجدے کا آخری داغ ہے ـــــ اور اس جگمگاتی ہوئی شاہراہ پر ایک بھولے بھٹکے اجنبی مسافر کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم کا آخری نقش ہے !!

اگر آپ نے بھی اس حقیر تحفے کو قبولیت کا شرف بخشا تو میں سمجھوں گا کہ بے نوا محبت کے بے رنگ پھولوں کو نگاہِ التفات سے دیکھنے والے ابھی موجود ہیں ـــــ !!

لطف الرحمٰن محمود

(بی۔ ایس۔ سی فائنل)

شذرات

سیلانی

نقد و نظر

(پیارے قارئین! یہ "ڈائری" میں آخری بار لکھ رہا ہوں۔ اس کے بعد مجھے اس محبوب کالم کا پیٹ بھرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔ سوائے اس کے کہ مجھے فیل کر کے واپس "ارسال" کر دیا جائے۔ اس صورت میں بھی شاید میں محروم ہی رہوں۔ اس کالم میں اگر میں نے کسی کے لطیف جذبات اور نازک احساسات کو عمداً یا سہواً مجروح کیا ہو تو میں صمیم قلب سے معذرت خواہ ہوں۔ محمود)

"ٹنڈ کراؤ" تحریک

کالج تو وہ چیز ہے کہ جس سے جناب فرعون کے محروم رہنے کا یاروں کو اب تک افسوس ہے۔ اس کی وجہ سیلانی کو آج تک معلوم نہیں ہو سکی البتہ یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ کالجوں میں ہر روز کچھ نہ کچھ ہوتا ہی جاتا ہے۔ اپنے کالج میں اگرچہ احباب نے کئی کرشمے دکھائے ہیں لیکن یہ "ٹنڈ کراؤ" تحریک تو واقعی خاصی تیز اور خوفناک تھی ——!

ایک رات سیلانی نے کچھ منحوس خواب دیکھے لیکن حسن اتفاق دیکھیے، صبح کالج آتے ہی ان خوابوں کی "تعبیر" بھی مل گئی! آتے ہی کئی ایسے دوستوں سے ملاقات ہوئی جن کے دماغوں میں خلل واقع ہونے کے امکانات ذرا کم تھے۔ ان دوستوں کو ایک روز قبل صحیح و سالم حالت میں پایا گیا تھا لیکن اس روز ان کی حالت ذرا غیر ہی تھی۔ وضع قطع میں "انقلاب فرانس" رونما ہو چکا تھا، حلیہ میں بھی ترمیم کی گئی تھی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ بعض ندرت خیز سر جہاں خمدار گیسو اور گستاخ کاکلیں پٹ سن کی طرح کاشت تھیں "ٹنڈوں" میں ڈھل کر سورج کی دھوپ میں دائمی ایرلیوٹ کی طرح چمک رہے تھے! ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی سانحہ نہیں! ایک رات کے اندر اندر اتنا تغیر؟ سیلانی حیران —— ع

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

جب حواس بحال ہوئے تو کچھ ہمت کر کے حالات کو کریدا گیا، پتہ چلا کہ یہ موسمی بخار وغیرہ قسم کی کوئی چیز نہیں بلکہ ایک اچھی خاصی منظم تحریک ہے جس کی "عقابی روح" نے ہاسٹل میں جنم لیا ہے —— الغرض جانیے اس کی "ولادت" اور پھر "انتقال پُر ملال" کے واقعات نہ صرف دلچسپ بلکہ بڑے "ایمان افروز" بھی ہیں۔ دروغ برگردن راوی —— ہاسٹل کے کسی پہنچے ہوئے "بزرگ" کے سر میں کچھ "بیرونی" تکلیف ہو گئی۔ جو بعد ازاں بدقسمتی سے "اندرونی" تکالیف کا رنگ اختیار کر گئی ——

علاج معالجے کے لئے انہوں نے سر صاف کروانا ہی تھا سو ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اور معتقدین سمجھے کہ یہ سب کچھ کسی "بالائی اشارے" کی بنا پر ہوا ہے۔ بہرحال اس طرح سادگی سے "افتتاح" کی پُروقار رسم ادا ہوئی! ابتدا میں تو بڑی مسکنت سے دعوتِ حق دی گئی —— لیکن بعد ازاں یہ لوگ "راست اقدام" —— پر بھی اتر آئے۔ انہوں نے ڈیڑھ اینٹ کی اپنی مسجد ہی علیحدہ بنا لی۔ دوستوں کے متمردہ ذہنے روایتی کی دیکھا دیکھی جھٹ انہوں نے قینچی کو "قومی نشان" قرار دے لیا۔ طرہ یہ کہ ان آلات کو سکھوں کی "کرپان" کی طرح "کلک" کا مقام حاصل ہو گیا۔ چنانچہ یہ تیز اوزار "اہل ٹنڈ" کی جیبوں میں ہمیشہ موجود رہتے! اہل ٹنڈ کا ایک وفد سیلانی کو بھی "تبلیغ" کرنے کے لئے آیا۔ دوران گفتگو میں نام تجویز کرنے کی فرمائش ہوئی۔ چنانچہ —— "اسلامک ٹنڈ ایسوسی ایشن" —— "اخوان المساکین" —— "انجمن حمایت ٹنڈاں" جیسے نام تجویز ہوئے۔ سیلانی نے اس تحریک کی ترقی کے لئے چندہ کی اپیل کا وعدہ بھی کیا! لیکن ہائے قسمت! یہ تحریک ایام طفولیت میں ہی داغ مفارقت دے گئی۔ گو یہ تحریک آج زندہ نہیں لیکن اس کی یاد

اب تک قائم ہے۔ جہاں تک "اقوال" کا تعلق ہے یہ تحریک تو بیخ شیلا لگئی تھی ---- اور اگر افعال اور اعمال کو جانچا جائے تو پھر "تاؤ ماؤ" "خوارج" یا "قرامطہ" یاد آجاتے ہیں! خیر سے اس تحریک کی کئی شاخیں تھیں ---- گورو عبداللہ صاحب کے پیرو کار رکھتے تھے کہ تیل صابن اور پانی کے لاینحل مسائل سے تنگ آکر یہ قدم اسلئے اُٹھایا گیا کہ نہ ہو بانس نہ بجے بانسری۔ دوسری "مثل" کے اصحاب نے بتایا کہ قربانی کے بکروں کی طرح منڈیاں باندھنے اور شکلیں کسنے کے بعد ان کے سروں پر اُسترا پھیر دیا۔ کئی احباب "ٹوپی" کے علاوہ اگلے سال یونین کا کوئی کلیدی عہدہ ملنے اور اس سال ہاسٹلوں میں "سٹورڈ" مقرر ہونے کی اُمید پر بھی انشراح صدر کے ساتھ منڈ گروالی۔ کئی بزرگ ایسے بھی تھے جنہوں نے تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارنے کے لئے یہ روپ دھارا۔ سیلانی صرف ان احباب کا مداح و معترف ہے! باقی فصلی بٹیروں کے متعلق سردست اپنی رائے محفوظ ہی ہے!

قارئین کو علم ہے کہ اردو میں "منڈ" ---- مٹی کے اس لوٹے کو کہتے ہیں جو رہٹ میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک لفظ "منڈا" بھی ہے جو غالباً ایک گول ترکاری کا نام ہے۔ بہرحال یہ منڈا اس منڈ کا مذکر نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے پانچ انگلیاں برابر نہیں بنائیں بعینہ اسی طرح "منڈلیں" بھی ایک سائز اور سانچے کی نہیں۔ چنانچہ یہاں بھی اگر سر بڑا ہوتا تو منڈ رہٹ کی منڈ لگتی اور اگر شومئی قسمت سے سر چھوٹا ہوتا تو گردن پر کوئی منڈ الٹا دکھائی دیتا! ہر دو صورتوں میں صاحب منڈ عجوبہ روزگار لگتا۔

یا اللہ! بات کہاں سے چلی تھی کہاں جا پہنچی! بڑی بڑی چیزوں کی طرح اس تحریک کو قبولیت عام کی سند تو حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ اکبر کے دینِ الٰہی کی طرح یونین کے گورو عبداللہ کی وجہ سے اُن کی کابینہ کے نورتن قسم کے خاص "درباری" اس تحریک کے ابتدائی فدائی بنے! ہاسٹل کے "صوبے" میں اس کا اثر زیادہ تھا۔ بے شک کئی احباب حضرت سید سبطین شاہ صاحب کی طرح غیر جانب دار رہے ہیں لیکن "ان" کا یہ مطلب بھی نہیں کہ عزبِ اختلاف سرد خاموشی تماشائی بنی رہی۔ سیلانی کے بعض دوست ایک آدھ گیلی سی ٹوپی منڈ پھیرا تے

اور پھر نہایت سلیقہ مندی سے اسے منکا منکا کر دیا دیتے! اگرچہ ایسے حالات کا مقابلہ کرنا آسان کام نہیں لیکن گورو جی کی شخصیت کی وجہ سے اہلِ منڈ کے پائے استقامت میں جنبش نہ ہوئی لیکن بدقسمتی سے گھر کے بھیدی نے ہی اس لنکا کو ڈھا دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ابھی سیلانی زیرِ تبلیغ ہی تھا کہ تحریک کے اصل بانی مبانی صحت یاب ہوگئے۔ اُن کے صحت یاب ہوتے ہی تحریک کی جان پہ بن گئی۔ اُن حضرت کے "رجوع" کے ساتھ ہی اکثریت "تائب" ہوگئی اور عملی طور پر یہ ہنگامہ خیز تحریک زندہ درگور ہوگئی! جوں جوں اُن کے سر پہ بال اُگتے آئے تحریک مرحومہ کے مزار پہ گھاس ---- آج وہاں زلف لہرا رہی ہے اور دیہاں سبزہ! افسوس ہے کہ "منڈ" کی اصل کی نوبت نہ آئی ---- اگر آج مرحومہ بقیدِ حیات ہوتیں تو یقیناً سیلانی مخیر اور متمول حضرات سے امدادی رقوم بمد "یتامیٰ و مساکین" بھجوانے کی درخواست کرتا۔

مری جبیں کو ہوا شوقِ سجدہ آرائی
بحدِ شوق میسر سنگِ آستاں نہ ہوا

ٹوپیاں ہی ٹوپیاں

کالج نے طلبہ کے لئے جو سادہ سی یونی فارم تجویز کی ہے وہ ایک عدد جناح کیپ اور ایک عدد "سیاہ گاؤن" پر مشتمل ہے۔ گاؤن خدا جانے کس مرحلے میں ہیں! البتہ ٹوپیوں کا "خوانچہ" تمام کیا گیا۔ یہ گیلی ٹوپیاں دساور سے درآمد کی گئیں اور پھر سرکاری راشن کی طرح "راشن کارڈ" پر طلبہ کو ملیں۔ ان ٹوپیوں کے متعلق آئے دن احکامات جاری ہوتے رہتے ہیں۔ طلبہ کا خیال ہے کہ اربابِ اختیار ٹوپیوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ ابتدائی قواعد کی رو سے یہ ٹوپی کالج کے اوقات میں سر پر ہونی ضروری تھی۔ ابتدا میں تو ایسے طلبہ جن کے پاس ٹوپیاں نہیں ہوتی تھیں ---- فوری طور پر اس طرح "جلاوطن" کئے جاتے تھے جیسے دودھ کے گلاس سے مکھی نکالی جاتی ہے! لیکن جب یہ جلاوطنی موثر ثابت نہ ہوئی تو چیکنگ کے ذریعے محترم پرنسپل صاحب کی قیادت میں کئی مرتبہ سینما تھیٹروں میں چھاپے مارے گئے۔ "مجرموں" کو جرمانے بھی ہوتے۔ پھر کالج کے اوقات کے بعد شام کے قریب ٹوپی پہننے کا حکم ہوا۔ اور آج جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی تھیں! ایک "تازہ آرڈیننس" کے ذریعہ طلبہ کو "ہدایت"

کی گئی ہے کہ وہ "اگر اپنی خیر چاہتے ہیں" تو چوبیس گھنٹے اس ٹوپی سے "مسلح" رہیں۔ سیلانی کو امید ہے کہ کالج عنقریب ہی طلبہ کے سروں پر کلپوں اور رنگوں کے ساتھ ٹوپیاں چپکانے کے لئے "فنڈ ٹونس" طلب کرے گا!! احباب تیار رہیں!!

طلبہ کے علاوہ اساتذہ سے بھی توقع کی گئی ہے کہ وہ بھی کالج میں ایسی ہی ٹوپیاں استعمال کریں۔ چنانچہ متعدد واجب الاحترام بزرگوں نے دستار و کلاہ تیاگ کر ان ٹوپیوں کو زینت بخشی ہے۔ اور تو اور کالج کے مردِ آہن ——— محترم مولانا خان احمد خان صاحب مدظلہ نے بھی ٹوپی پر قناعت کر لی ہے! ——— کاش اللہ تعالےٰ مبارک کرے!!

سیلانی کا اصل موضوع "طلبہ اور ٹوپیاں" ہے کسی نے سچ کہا ہے "نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی" ——— یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس کالج کے طلبہ کے سروں پر ٹوپیاں دیکھ کر ہی یہ شعر گھڑا ہے! یہ تو ٹھیک ہے کہ ٹوپیاں ایک سی ہیں ——— لیکن پہننے میں جدت سے کام لیا جا رہا ہے! کئی احباب ٹوپی کو ٹوپی سمجھ کر استعمال کر رہے ہیں لیکن اکثریت ——— "ادب برائے ادب" کی طرح "ٹوپی برائے ٹوپی" کی قائل ہے! ان کا خیال ہے کہ ٹوپی یا تو کوئی دستانہ ہے یا پھر کسی خیالی بساکھی کا بالائی حصہ ہے جسے ہر وقت بغل میں رکھنا ضروری ہے! ——— کئی حضرات ذرا زیادہ ہی نازک اور گل اندام واقع ہوئے ہیں! ٹوپی سر پر رکھتے ہی ان کی حالت نازک ہو جاتی ہے اور اسی روایتی بیل کی طرح منہ بسورتے ہیں جس نے ——— کرۂ ارض کو سینگوں پہ سہارا ہوا ہے!! اب ذرا پہننے والوں سے سنئے ——— ہر ایک نے اپنے اپنے سلیقے کے مطابق "سٹائل" تراش لیا ہے کہیں کان پوشیدہ ہے کہیں جبین مضمر ہے کہیں ٹوپی صراحی دار گردن سے چپکی ہوتی ہے ——— اور کہیں ناک پر الٹی ہوتی ہے ——— کئی حضرات ٹوپی اس طرح سر پر جماتے ہیں کہ بے چارے مُرغ یاد آنے لگتا ہے!! اور پھر کئی منچلے اسے اس طرح توڑ مروڑ کر جیب میں ٹھونستے ہیں جس طرح میانی صاحب کے قبرستان میں اتفاقاً قبر تنگ نکلنے پر مظلوم میت کی درگت بنائی جاتی ہے! پھر جیب سے نکال کر اسے اس طرح سر پر رکھتے ہی سے "فٹ" کیا جاتا ہے کہ یہی جناح کیپ پشاوری قراقلی کی طرح گول ہو جاتی ہے! سبحان اللہ ع

ایں سعادت بزورِ بازو نیست!

ٹوپی کے "اجراء" کے ساتھ ہی ایک نئی چہل پہل شروع ہو چکی ہے ماحول کی تازگی اور شگفتگی پر بھی اس کا اثر پڑا ہے کیونکہ "والی بال" کی دلچسپی کا زریں موقع مل جاتا ہے! "ٹوپی پوش طلبہ" اپنی مخصوص "شیخی" اور "مسکینی" کے باوجود ہشاش بشاش نظر آتے ہیں ——— یہ ٹوپیاں ——— ستمبر ٹسٹ میں بھی ساتھ رہی ہیں۔ بلکہ وہ قسمت کے مارے جو ان سے محروم تھے ——— انہیں جبراً ہجرت پر مجبور کیا گیا ——— ممکن ہے کئی حضرات نے ٹوپیوں کی موجودگی سے فائدہ بھی اٹھایا ——— یہ جناح کیپ "اسرارِ سلیمانی ٹوپی" ثابت ہو سکتی ہے ——— فقط "ہاتھ کی صفائی" کی ضرورت ہے "ہاں جان! آزمائش شرط ہے!!"

ان ٹوپیوں ——— کا اثر صرف کمرۂ امتحان تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ "سرکاری" مباحثے اور دعوتیں بھی ان سے متاثر ہوتی ہیں ——— سیلانی کے ایک مظلوم دوست کو مجبوراً "سٹیج" سے اترنا پڑا اور پھر "دسترخوان" سے بھی اٹھنا پڑا ——— !! ان حادثات کا سیلانی کو بہت صدمہ ہے۔ فضول ٹوک انسانی فطرت میں داخل ہے ——— لیکن بسا اوقات عجیب و غریب نتائج برآمد ہوتے ہیں!

سیلانی کو ٹوپیوں کے معاملے میں صرف ایک بات اور کہنا ہے اور وہ یہ کہ داخلے کی میز پر جن احباب کو "لائسنس" نہیں ملا ——— ازراہِ کرم ان کی ٹوپیاں نصف قیمت پر واپس لینے کا فوری انتظام کیا جائے ———!

باسکٹ بال ٹورنامنٹ

محترم خان نصیر احمد خان صاحب کی نگرانی میں دو چیزیں ہیں ایک تو محترمہ "ٹونیتا" ہیں اور دوسری باسکٹ بال کلب ——— خان صاحب کو "مسیحائی" میں بھی ید طولیٰ حاصل ہے ——— یہ دونوں چیزیں جب سے خان صاحب کے گلے پڑ گئی ہیں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں ——— لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سال خان صاحب موصوف نے صرف

باسکٹ بال کی جنس پر ہی ہاتھ رکھا ہے! کیونکہ یوٹین نے اس سال "چوکا" لگائے
نمایاں "سراج" دیئے ہیں وہ قارئینِ "المنار" پر روزِ روشن کی طرح واضح ہیں!
"یوٹین" کو سیلانی کسی علیحدہ جگہ یاد کر رہا ہے ——! فی الحال باسکٹ بال
کو لیجئے ——

—— جن بیچ ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کیلئے اپنا کالج مشہور
ہے "باسکٹ بال ٹورنامنٹ" ان میں سرِفہرست ہے! اس سال بھی یہ
مقابلے پورے جوش و خروش سے منعقد ہوئے۔ ہفتہ عشرہ پہلے ہی تیاریاں
شروع ہو گئیں۔ کھلاڑیوں کی رہائش و آسائش کے لئے معقول انتظامات
کئے گئے۔ صفِ اوّل کے کمرے مہمانوں کے اعزاز میں خالی کر دیئے گئے۔
ان کمروں کا فرنیچر برآمدوں اور دیگر کمروں "ولان" میں جمع ہونا
شروع ہو گیا۔ ٹورنامنٹ سے ایک دن قبل لان میں مختلف الاشکال
چارپائیوں کے انبار لگ گئے —— دیہات سے آنے والی ان چارپائیوں
کو "امریکی ایڈ" کی طرح گرمجوشی سے وصول کیا گیا۔ یوں تو دیہات کی ہر
چیز انوکھی ہوتی ہے مگر یقین جانیئے دیہات کی چارپائیاں بھی عجیب شے
ہوتی ہیں —— پہلی قسم کی اکثر چارپائیاں مضبوط تھیں لیکن دوسری قسم
کی چارپائیاں کچھ زیادہ ہی "نحیف و نزار" تھیں! کچھ نوادر واقعی قابلِ دید
تھے۔ مثلاً کئی چارپائیاں ایسی بھی تھیں جو خالی ہونے کی صورت میں "مستطیل"
لگتی تھیں لیکن اگر ان پر کوئی قسمت کا مارا بیٹھ جاتا تو پھر یہ چارپائیاں
"متوازی الاضلاع" بن جاتی تھیں! کئی چارپائیاں سرے سے ہی "موج"
کی طرح ہو کر رہتی تھیں۔ کئی ایسی بھی تھیں کہ اٹھاتے وقت موسیقی کی سُریلی دُھنیں
الاپنا شروع کر دیتی تھیں! یہ چارپائیاں دو یوم تک لان میں سیلاب زدگان
کے اثاثے کی طرح لاوارث پڑی رہیں۔ بعد ازاں "حسبِ منشا" چارپائیوں
کو کمروں میں بچھایا گیا۔ موسیقی نواز اور جیومیٹری کے مسائل سے شغف رکھنے
والی چارپائیاں —— سیلانی کی درخواست پر علیحدہ کر لی گئیں۔ اوّل الذکر
نوادر تو کسی عالمی نمائش میں بھیجے جائیں گے البتہ مؤخر الذکر چارپائیاں
اگر شعبہ "ریاضی" کو مرحمت فرمائی جائیں تو ہمیں نوازش ہوگی کیونکہ ریاضی والوں
کا اس میں ہر لحاظ سے بھلا ہے!!

وقتِ مقررہ سے قبل پاکستان کی معروف ٹیمیں ربوہ پہنچ گئیں۔ کئی
بین الاقوامی شہرت کے کھلاڑی بھی آئے۔ ٹورنامنٹ سے قبل ربوہ میں حسبِ معمول
مطلع صاف تھا۔ ویسے اگر اس خشک علاقے میں مطلع ایک معقول مدت تک صاف
رہا ہے تو پھر دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہاں کی فضا بھی
صاف نہیں —— چنانچہ ان ایام میں بھی گرد کی جھڑی ایک موٹی تہہ شکلوں
سے لپٹی ہوئی تھی! اور عوام الناس کے تپق ہو جانے کے امکانات روشن
ہو گئے تھے —— اس موسم اور اس ماحول میں ٹورنامنٹ قریب آ گیا۔
سیلانی کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ احباب نمازِ "استسقاء" کے لئے پر تول رہے
ہیں —— لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ نمازِ استسقاء کا "جواب" افتتاح کے روز ہی
ملے گا! حسنِ اتفاق دیکھئے افتتاح کے روز ہی فجر کی اذان کے ساتھ ہی
موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ قدرت نے جھنڈیوں، دریوں، قناتوں،
خیموں، کرسیوں، میزوں، شامیانوں، غرض ہر چیز کو "غسل" دیکر پاک صاف و پوتر
بنا دیا! پہلے کچھ دیر تک انتظار ہوتا رہا کہ اب بارش تھمتی ہے اب مطلع
صاف ہوتا ہے۔ اب رستے خشک ہوتے ہیں۔ اب لوگ آتے ہیں......
مگر جب ساری نظریں جھک گئیں اور امید کی ٹمٹماتی کرن بھی ترچھی ہونے
لگی —— تب ان نامساعد حالات میں افتتاح کی رسم ادا کر دی گئی ——
پہلے ہی کافی سادگی ہوتی ہے اس دن تو حد ہی ہو گئی —— نہ سلام نہ دعا
نہ مہمان نہ معمول —— بس ایک سیٹی بجی اور افتتاح —— ہو گیا!! افتتاح
کے ساتھ ہی سردی کی یورش بڑھ گئی۔ ہوائیں اور زیادہ خنک ہو گئیں۔
بارش میں تیزی آ گئی —— مگر اب تیر کمان سے چھوٹ چکا تھا —— جب
تیر کھلاڑیوں سے باہر آ چکے تھے —— چنانچہ پروگرام کے مطابق مقابلے
شروع ہو گئے۔ تماشائی کھیل سے دلچسپی رکھنے کے جرم میں بھیگتے رہے!
اپنے منتظمی صاحب کی رفاقت کی وجہ سے سرِسام کی نوبت تو نہ آئی البتہ
کچھ غنودگی اور بے حسی ضرور طاری ہو گئی —— ان ایام میں "کتابی کیڑوں"
کے افراد کے لئے گھنٹیاں نہایت باقاعدگی سے بجوائی گئیں۔ یہ کتابی کیڑے کتابوں
کو چاٹتے چاٹتے اللہ کو آئی مگر خوراک اور سامانِ رسد "یعنی کتابیں" دبا کر
بغل میں —— ساتھ ہی رکھیں!! پہلے دن کھیل سے قبل بہادرے ہی [illegible]
کھیل پہل رہی [illegible] صاحب [illegible] کو "نمبر وار" لگ گیا تھا —— دوسرے
دن ہی اللہ میاں کے فضل سے مطلع صاف ہو گیا۔ راستے خشک ہو گئے
سردی کم ہو گئی۔ مقابلوں کی شہرت سن کر باہر سے بھی مہمان آئے ہوئے تھے
مقامی تماشائیوں کا بھی ہجوم ہو گیا۔ یوں سمجھئے کہ کھیل اپنے جوبن پر آ گیا۔

کھلاڑیوں نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ ایسے ماحول میں طنز و مزاح کا دور بھی چل پڑتا ہے ـــــ لیکن اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی "زندہ دلی" کا مظاہرہ ہوا ہے! تیسرے دن دوپہر کو فائینل ہوئے۔ سکول سیکشن میں مشن سکول راولپنڈی نے میدان مارا۔ پھر کالج گروپ میں ایف سی کالج لاہور کے ساتھ اپنے کالج کی ٹیم کا مقابلہ ہوا ـــــ اپنے کالج کو داد نہ دینا بہت بڑی ناانصافی ہوگی! ہار جیت تو الگ چیز ہے۔ اس کے بعد کلب کی باری آئی۔ برادرز اس سال پولیس کو پیچھے چھوڑ گئے۔ کلب کے مقابلے سے قبل مارچ پاسٹ اور بعد میں تقسیم انعامات کا جلسہ ہوا۔ محترم چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب نائب صدر عالمی عدالت نے انعامات اور سندات تقسیم فرمائیں۔ اگر کیمرے حرکت کرتے رہیں تو کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہتی ہے! ایسے عالم میں تماشائی بھی اس "عزت افزائی" کی زد میں آنے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں! قارئین کو علم ہوگا کہ کالج ایسی تقریبات کی فلم تیار کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا معقول انتظام تھا۔ مرزا مجیب احمد اور محمود احمد خان "کیمرہ مین" تھے۔ کیمرے تو بڑی فراخدلی سے "فوکس" ہوتے رہے ہیں ـــــ آگے کچھ خبر نہیں!!

اس ٹورنامنٹ کو اس مرتبہ اتنی اہمیت حاصل ہو گئی تھی کہ "پنجاب چیمپین" کے انتخاب کے لئے سلیکشن کمیٹی کے معزز اراکین بھی ربوہ آئے۔ باسکٹ بال کو یہاں قائم ہوئے ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں۔ اس قلیل مدت میں نمایاں ترقی کی گئی ہے۔ جس کے لئے محترم پرنسپل صاحب اور محترم خان صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں ـــــ!

سالانہ مباحثے

ربوہ میں سب سے زیادہ ہنگامہ خیز اور محشر آفرین تقریب ـــــ "سالانہ مباحثوں" کو سمجھا جاتا ہے ـــــ اس سال بھی یہ مباحثے اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوئے مگر ـــــ! مغربی پاکستان کی متعدد معروف یونیورسٹیوں اور مشہور کالجوں نے شرکت کی۔ مباحثوں سے چند روز قبل ہی کالج میں "ہفتہ صفائی" شروع ہو گیا ـــــ رنگ و روغن کا سلسلہ چل نکلا۔ پھول بوٹے سجائے جانے لگے ـــــ ہال میں لگی ہوئی تصاویر سے گرد اڑائی گئی ـــــ دیواریں چمکائی گئیں۔ فرش صاف ہوا "عرش" بیچارے گملے ہی بھی انسانی قدموں کی جانب مسکراتی دینے لگے۔ کرسیوں

کی نقل و حرکت جاری رہی "بیانات" اور "دعوت نامے" چھپوا لئے گئے۔ پرنٹنگ پریس کے ایک ذمہ دار کارکن نے سیلانی کو بتایا کہ چار مرتبہ ان دعوت ناموں میں ترمیم ہوئی ہے ـــــ آخری مرتبہ محض اس لئے ترمیم ہوئی کہ ایک عہدیدار کے نام کے ساتھ لفظ "چوہدری" ذرا واضح اور شوخ نہیں تھا! سبحان اللہ کیا انکساری کی ایسی مثال آپ کو اس دنیا میں کہیں مل سکتی ہے؟ بہر حال آخری دن پروگرام ـــــ اعلان ـــــ کارڈ ـــــ اور دعوت نامے سب کچھ چھپ کر آ گیا! "سٹیوڈنٹوں" کی فوج ظفر موج کی "خاص" بھرتی ہوئی ـــــ سٹیوڈنٹ منتخب کرنے کا معیار یہ ہے کہ وہ "سنگدلی" میں "کالج گیر" شہرت کے حامل ہوں ـــــ تاکہ ان کے تلخ سلوک کی یاد سے ایک عرصہ تک سامعین کو صمیم قلب سے بد دعا دینے کی تحریک ہوتی رہے!! اگر جان کی امان دی جائے تو سیلانی کا ذاتی "خوف" یہ ہے کہ سٹیوڈنٹ ایسی چیز ہیں کہ ان کا ذکر کرنے یا سننے کا ارادہ کرنے سے ہی وضو کیا ہوا بھی ٹوٹ جاتا ہے!! لیکن اب مجبوری ہے سُن ہی لیجئے! یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ایک عام سٹیوڈنٹ کی آمرانہ شہنشاہیت سات آٹھ گھنٹے کے بعد دم توڑ دیتی ہے ـــــ لیکن اتنی قلیل وقت میں ان کے قالب میں ضحاک اور سفاح کی روح کارفرما ہو جاتی ہے! دوسرے کالجوں میں بھی سٹیوڈنٹ مقرر ہوتے ہیں مگر مجال ہے کہ ناجائز دباؤ ڈالنے کی جرات کریں ـــــ اس کے برعکس یہاں تو ایسی دھونس جماتے ہیں کہ الامان و الحفیظ ـــــ تقریباً تمام سٹیوڈنٹ کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ سامعین میں سے ہر ایک کی زبان گدی سے کھینچ کر جدا کر جائیں!! لیکن سارے سٹیوڈنٹ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ سیلانی حضرت خادم کی شرافت سے بہت متاثر ہوا ـــــ خادم صاحب صحیح معنوں میں مخدوم ثابت ہوئے۔ بارہا کوئی شرارت سوجھتی لیکن موصوف کی شرافت کی وجہ سے کچھ انتظار کرنا پڑتا! جب باسط صاحب "ڈیوٹی" پر جاتے تو پھر احباب "باجماعت" شرارت کرتے! ـــــ اللہ تعالیٰ ان حضرت کو جزائے خیر دے جنہوں نے سیلانی کے دو تین دوستوں کو جدا کر کے "فتنے" کا کسی حد تک سدِباب کیا! باسط صاحب کے علاوہ قمر صاحب بھی "ہمدرد خلائق" ہی نکلے۔ دو "معصوم فرشتوں" کے علاوہ سیلانی "طیراً ابابیل" کی طرح آنے والے باقی تمام سٹیوڈنٹ پر تاب

لاحول بھیج دیا ہے ——— اور انشاء اللہ نہایت پابندی کے ساتھ اپنی پنجگانہ "بددعاؤں" میں انہیں ہر حال میں تا "پی ۔ایس سی" یاد رکھیگا ——— !!

اب ذرا عہدیدار حضرات سے ملئے ——— ان مخصوص ایام میں یہ بزرگ بھی فرش سے عرش پر جا پہنچتے ہیں ۔ سیلانی کو اللہ کے فضل سے "پاسپورٹ" یا "ویزے" کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی ۔ اکثر دوست قانون کے پابند ہیں باقی معروف "سمگلر" ہیں !! گیٹ یا دیوار سے اندر آنا ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے ! لیکن باقی احباب نے سیلانی سے عہدیداروں کی بے التفاتی کا شکوہ کیا ہے ۔ دوستوں کو ان احباب سے یہ توقع رکھنی چاہیئے ۔ ووٹ کے لئے کی جانے والی خوشامد کا انتقام وہ اگر ان ایام میں نہ لیں تو کب لیں ؟ ؎

اس قدر اجنبی تو نہ بن اے دوست
رسم دنیا کا بھی خیال نہیں !

پہلے روز انگریزی مباحثہ ہوا ۔ مقررین نے دھواں دھار تقریریں کیں ۔ مگر اس کثیف دھوئیں میں سامعین کا دم گھٹنے لگا ۔ عام تبصرہ یہی تھا ——— "بڑی بور بحث ہوئی ہے" ! صد شکر کہ شعر و سخن کا دور چلا ۔ خشک و تر تقریروں کو سن کر جو اذیت ہوئی تھی وہ دور ہوگئی ———

دوسرے دن اردو مباحثہ ہوا ۔ "انسان کا مستقبل روشن ہے" کی قرارداد پر بحث ہوئی ۔ تقریباً دو درجن مقررین نے حصہ لیا ۔ طنز و مزاح کا سلسلہ جاری رہا ۔ جس نے آخر میں زیادہ "سنگین" صورت اختیار کر لی ! اس شعبہ سامعین بیزاری کی بجائے دلچسپی لیتے رہے !

جہاں سالانہ مباحثوں کی مجموعی حیثیت کا تعلق ہے اگر معیار کی پستی کو نظر انداز کر دیا جائے تو انہیں بھی "کامیاب" قرار دیا جا سکتا ہے !!

یہ خوابیدہ یونین

اس تعلق میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا یونین کا بھی غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا جائے ——— لیکن سیلانی کو ڈر ہے کہ کہیں حقائق کی تلخی شدت سے محسوس نہ کی جائے ۔ تاہم ؎

خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے !

یونین کے لچھن ابتدا سے ہی کچھ پسندیدہ نہ تھے ۔ گزشتہ سے پیوستہ شماروں میں سیلانی یونین کے "تاریک مستقبل" کے متعلق پیشنگوئی کر چکا ہے بدقسمتی سے جو ناخوشگوار توقعات یونین سے وابستہ کی گئی تھیں ——— وہ ایک ایک کرکے نہایت صفائی سے پوری ہو چکی ہیں ! آخر سال کے دوران میں یونین نے کیا نمایاں کارنامے سر انجام دیئے ہیں ——— کہ آج اس کا نام عزت کے ساتھ لیا جائے ؟ سالانہ مباحثوں کا بیڑا اگر وقتی طور پر علیحدہ کر دیا جائے ——— تو یونین کا کھیسہ خالی ہی نظر آتا ہے ——— سیلانی کی تحقیق کے مطابق یونین کی عظمت و وحدت کا پرچم نفاق اور خانہ جنگی کے ہاتھوں سرنگوں ہوا ہے !!

سالانہ مباحثوں کے علاوہ ——— ایک دو اور مباحثے بھی ہوئے ہیں جن کا معیار بدقسمتی سے نہایت پست تھا ۔ حاضری برائے نام تھی ، انتظام مفلوج تھا ۔ پھر ایک دو لیکچر بھی ہوئے جو غالباً "کسی حادثے" کا نتیجہ تھے !! مثلاً قاہرہ کے اخبار "الجمہوریہ" کے چیف ایڈیٹر جناب السید محمد محمود صاحب اپنے پروگرام کے مطابق پنڈی آئے ۔ آپ جب کالج دیکھنے آئے تو تقریر بھی کروا لی گئی ——— اپنی کوشش سے تو شاید ایک آدھ مہمان باہر سے بلوایا گیا ہے !

مباحثوں کے لئے مقررین کی "ٹیمیں" باہر بھجوانا بھی یونین کا کام ہے ۔ اس سلسلے میں بھی کافی تاخیر اور تساہل سے کام لیا جاتا رہا ہے ۔ لیکن اس معاملے میں یونین بے قصور ہے ۔ "یونین معصوم ہے ، یونین مظلوم ہے ، یونین مفلوج ہے" ! مقرر کہاں سے لائے ؟ آخر یونین آفس میں کوئی مشین تو ہے نہیں کہ سکوں کی طرح ڈھلے ڈھلائے مقرر تیار ہو سکیں ! لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقرر تیار کرنا کس کا کام ہے ؟ کیا مقرر فزکس یا کیمسٹری کی لیبارٹری میں تیار کئے جا سکتے ہیں ؟ کیا انہیں فٹبال کی گراؤنڈ میں کاشت کیا جا سکتا ہے ؟ یا کیا انہیں پولیٹیکس کی شاخوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے ؟ مقرر یونین نے پیدا کرنے ہیں ! یونین ہی پیدا کرتی رہی ہے اور یونین کو ہی پیدا کرنا پڑیں گے ——— !

سیلانی تسلیم کرتا ہے کہ مقررین کی "ٹیمیں" باہر بھجوائی گئیں ——— مگر کیا صرف گنتی کے تین چار مقرر ہی "تجلی" نہیں ہوتے رہے ؟ وہی پرانے گھاگ مقرر ——— جو تین چار سال سے کالج کی نمائندگی کرتے کرتے "بوڑھے" ہو چکے ہیں ! آہ ؎

کچھ ہوسکے تو یہی رندانِ قدح خوار کو دے

کیا یونین کا کوئی نمائندہ طلبہ کو بتا سکتا ہے کہ کس نئے کالیا؟ مقرر میں اسٹیج پر آنے کی جرأت پیدا کی گئی ہے؟ یہ گنتی کے چار مقرر آخر کب تک کالج کا نام روشن کرتے رہیں گے؟ سوائے اس کے کہ وہ خدانخواستہ فیل ہوتے رہیں — اگر یہ مقرر اس سال پاس ہو گئے — تو ان کی جگہ لینے کے لئے مقرر کہاں سے لائے جائیں گے؟ اگر کامیاب مقرر پیدا نہ ہو سکے تو کالج کی درخشندہ روایات کیسے برقرار رہ سکیں گی؟ سیلانی چار سال سے اسی کالج سے وابستہ ہے لیکن ایسی شکستگی اور ناامیدی یونین پر کبھی نہیں گزری — گزشتہ چند سالوں سے ہماری یونین کی سرگرمیاں تعداد اور معیار کی بلندی کے لحاظ سے دوسرے تمام کالجوں کو مات کرتی رہی ہیں — اور محترم خان صاحب اس کا کئی مرتبہ اظہار فرما چکے ہیں۔ مگر اس مرتبہ خدا جانے اس یونین کو کیوں سانپ سونگھ گیا؟

کام کرنے کا وقت اب جا چکا ہے۔ سارا سال تو خوابِ خرگوش میں محو رہنے کا دھبہ یونین کے پاک اور سفید دامن پر لگ چکا ہے۔ صرف ایک ہی صورت ہے کہ اگلے سال اچھے نمائندے منتخب کئے جائیں جن کا پہلا اور آخری مقصد — "صدارت" — "ڈنر" — اور "تصویر" نہ ہو!

اب غالباً "آخری تصویر" کا مرحلہ باقی ہے۔ خدا کرے یہ زلفِ عنبر فشاں بھی کامرانی کے ساتھ سر ہو جائے! — اس کے بعد یہ تصویر حسبِ معمول یونین آفس میں آویزاں کر دی جائے گی۔ لیکن بقول غالب ؎

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو
تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

کاش ان عہدیداروں کی تصویر — جن کے "عہدِ سعادت مہد" میں یونین کی کارکردگی کا بیڑہ غرق ہوا ہے — درخشندہ روایات کا بڑی دھوم سے جنازہ اٹھا ہے — اور کارکردگی و عمل کے لحاظ سے قدم تنزل کے تاریک گڑھے کی طرف بڑھا ہے — اُن کی "تصویرِ عبرت" کے لئے اگلے سال الیکشن سے پہلے نوٹس بورڈ پر لگائی جائے — تاکہ طلبہ "سبق" کا درس لے سکیں!!

باتیں شاید ذرا تلخ ہیں — مگر یہ دہی کھٹا تھا سیلانی۔ ضمیر کے ہاتھوں مجبور تھا کہ آخری بار بھی اسے کھٹا ہی کہتا!! ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے آبلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

"پیرِ صحافت" کی آمد

اپنا کالج اگرچہ شیر شاہ سوری کی تعمیر کردہ سرائے نہیں۔ لیکن پھر بھی مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اس میں کچھ مہمان نوازی کا اثر ہے اور کچھ دخل اس نسبت کا بھی ہے جو ربوہ کو دیارِ حبیب سے ہے!! کچھ مہمان اپنے اشتیاق کی تسکین کے لئے آتے ہیں اور رہی سہی کسر ہم کالج پوری کر لی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ درمیانی عرصے میں پوری تیزی سے جاری رہا۔ آنے والے معززین میں سے ایک مہمان ایسے تھے جن سے ملنے کی خواہش مدتوں کا دم اختیار کر چکی تھی!! خدا کا یہ شکر ہے کہ سیلانی کی یہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی — یعنی — سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون کی نیاز حاصل ہوا۔ سردار صاحب محتاجِ تعارف نہیں "ناقابلِ فراموش" نے انہیں ناقابلِ فراموش بنا دیا ہے "ریاست" مرحوم انہیں بقائے دوام بخش گیا ہے — "ناقابلِ فراموش" پڑھ کر یہ خواہش دل میں چٹکیاں لینے لگی کہ ایسے بے باک اور صاف گو صحافی سے ضرور ملنا چاہیئے۔ سیلانی اور رحمی صاحب پاسپورٹ یا ویزے کے چکر میں تھے کہ سردار صاحب خود ہی یہاں آ گئے! جب ان کے آنے کی خبر گرم ہوئی تو ادارہ میں جگہ جگہ طلبہ کی ٹولیاں جم گئیں اور سردار صاحب کی جرأت مندانہ پر تبصرے ہونے لگے! آنِ واحد میں طلبہ میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور سرِ شام اسٹیشن پر عقیدتمند طلبہ کا ہجوم ہو گیا سردار صاحب اتر کر گیسٹ ہاؤس چلے گئے۔ اس طائرانہ درشن سے سیلانی کو سکونِ قلب نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ جناب ابوبکر رحمی صاحب اور سیلانی پر مشتمل قافلے نے گیسٹ ہاؤس کا رخ کیا۔ وہاں سردار صاحب بڑے تپاک

ایڈیٹر کے نام خطوط

قارئین

اظہارِ خیال

(مکتوب نگار حضرات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ ادارہ)

مکرمی!

"المنار" کا شمارہ کافی انتظار کے بعد ملا۔ اس تاخیر کا باعث "انگریزی سیکشن" کے سوا اور کون ہو سکتا ہے! وقت کی پابندی نہ کرنا چونکہ ہمارے مشرقی مزاج کا خاصہ ہے اس لئے مجھے اس تاخیر پر احتجاج کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں!!

مضامین و منظومات معقول تھے۔ "چناں دیاں چھلاں" کو اسی آب و تاب سے جاری و ساری رکھنے کے لئے آپ کو کافی محنت کرنا پڑے گی۔ جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے۔ غالباً آپ ہی "سیلانی" کے روپ میں جلوہ گر ہو کر بہت کچھ لکھ ڈالتے ہیں۔ کیا آپ کے انقطاع کے بعد بھی یہ کالم جاری رہے گا؟ میرا خیال ہے اسے ضرور جاری رہنا چاہیئے کیونکہ اساتذہ و طلبہ کی اصلاح کا یہی واحد ذریعہ ہے۔!

"پسندیدہ اشعار" پڑھ کر سخت کوفت ہوئی معلوم ہوتا ہے کوئی اشد مجبوری تھی جس نے آپ کو نصف کالم ابھارنے پر مجبور کر دیا۔ میں آپ کی توجہ آپ کے اس قول کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں — کہ "پسندیدہ اشعار کا کالم غیر شادی شدہ مستورات کا بہترین اثاثہ ہے" — اگر پسندیدہ اشعار شائع کروانا واقعی ایک "نسوانی کمزوری" ہے تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کیوں اس "کمزوری" کی سرپرستی فرما رہے ہیں؟ آپ کے پاس جو پسندیدہ اشعار آئیں انہیں المنار میں چھاپنے کی بجائے — "عفت"، "زیب النساء" — "خاتون" — اور "ہمدرد نسواں" وغیرہ کو بھیج دیا کریں۔ کیونکہ وہی ان کا صحیح مقام ہے!! ویسے طلبہ کے رسالے کی حیثیت سے — المنار ان چند بہترین رسالوں میں سے ہے جنہیں میں عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔"

امان اللہ اعوان

(آپ کی ہدایت کے مطابق اس مرتبہ پسندیدہ اشعار کو "منزلِ مقصود" پہ پہنچانے کی نیت تھی لیکن شومیٔ قسمت کوئی "کھیپ" موصول نہیں ہوئی —— ادارہ)

مکرمی!

"المنار" کا تازہ شمارہ میرے سامنے ہے۔ اس کے مضامین معیاری ہیں۔ سوائے ایک آدھ مضمون کے جس پہ "سرقہ" کا شبہ ہوتا ہے —! "نقد و نظر" کا جواب نہیں۔ پڑھ کر دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا۔ میرے خیال میں اگر ایک ورق "سوال و جواب" کے لئے مخصوص کر دیا جائے تو المنار کی رونق یقیناً بڑھ جائے گی۔

شاعر حضرات کی صف میں چند "نئے چہرے" دیکھ کر خوشی ہوئی — مگر تھوڑا سا افسوس بھی — کہ ان کی شاعری کی اٹھان اسی فرسودہ ذہنیت کی غماز ہے جو اب تک قوم کی قوتِ عمل کو مشتعل

محبت کے صحراؤں میں بھٹکانے کا موجب رہی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمارے نئے شاعر وقت کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اپنی فکری و ذہنی صلاحیتوں کو قومی، ملکی اور جماعتی تقاضوں کے ہم آہنگ کر دیں۔؟

بحیثیت مجموعی لحاظ سے المنار کا یہ شمارہ پہلے شماروں کی نسبت زیادہ معیاری اور زیادہ پسندیدہ ہے۔

منور احمد

(جہاں تک ایک آدھ مضمون کے "مالِ مسروقہ" ہونے کا تعلق ہے جب تک واضح اور یقینی ثبوت نہ ہو یہ شبہ "بدظنی" کی حدود کے قریب قریب ہی ہے۔ آپ یا تو کوئی واضح اور یقینی ثبوت فراہم کریں یا پھر "استغفار کریں"! البتہ ادارہ کو توقع نہیں کہ اس کی اس حسن ظنی سے احباب "فائدہ" اٹھائیں گے۔ ادارہ)

محترمی!

ایک صبر آزما انتظار کے بعد "المنار" ملا۔ پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ ایک دفعہ پڑھنے کے بعد بھی ہاتھ سے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ ہمارے المنار میں سے حضرت سیلانی کا "نقد و نظر" میری نظر میں بہت بلند اور عروج پر تھا۔ حضرت سیلانی موصوف کی گزشتہ تحریر بھی میری نظر سے گزری ہیں مگر جو لطف اور چاشنی گزشتہ رسالہ میں تھی اس کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

حضرت زرتشت کا مضمون "ان سے ملئے" بہتوں کی "اصلاح" کا موجب ہوا۔ جزاک اللہ خیراً۔

"افکارِ عالیہ" کے تحت محترمی چوہدری محمد علی صاحب کی غزل بہت پسند آئی۔ بالخصوص ذیل کا شعر اپنی مثال آپ ہے ؎

ایک تجھ سے وفا کی تھی امید
تو بھی لوگوں کا ہم خیال ہوا!

"جھٹاں دیاں جھلاں" ——— المنار میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ سی۔ ایل۔ ایم ہے کا مضمون ٹھوس اور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ "عبد العلی" اب چند روز کے مہمان ہیں اسلئے میں ان کو مبارکباد دیتا ہوں کہ ان کا "عہد" نہایت شاندار اور درخشندہ ہے۔

(فقط "جزاک اللہ" ——— ادارہ)

سر!

المنار کا گزشتہ شمارہ پڑھا۔ میں معنوی خصوصیات پر تبصرہ نہیں کروں گا کیونکہ اور بہت سے نقاد اس کام کے لئے پہلے ہی معقول تعداد میں صفحۂ ہستی پر موجود ہیں۔ میں آپ کی توجہ صوری حسن کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ نے محنت کر کے المنار کے ظاہری حسن میں اضافہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ گزشتہ شمارے پر کافی قیمتی "گلیزڈ پیپر" لگوایا گیا تھا۔ بے شک اس سے اس کا حسن تو دوبالا ہوا لیکن صحیح لحاظ سے "لیتھو" کے کام میں اس قسم کے خوبصورت اور بہت زیادہ ملائم کاغذ پر سیاہی کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں کتابت کا وہ معیار قائم نہیں رہ سکا۔ یہ زیادہ مناسب ہے کہ یہ قیمتی "گلیزڈ پیپر" نہ لگوایا جائے۔

نصیر احمد

(آپ کی گرانقدر رائے مشعلِ راہ کا کام دے گی!
——— شکریہ ——— ادارہ)

پیر صحافت کی آمد

(بقیہ صفحہ ۱۲)

سے ملے۔ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے خوب جی کھول کر باتیں ہوئیں "ریاست" اور "ناقابلِ فراموش" پر تبصرہ ہوا۔ آتی دفعہ انہیں کالج تشریف لانے کی دعوت دی گئی آپ نے وعدہ کیا اور پھر وقت مقررہ پر آئے۔ وہاں کیمسٹری تھیٹر میں "سوال و جواب" کی ایک دلچسپ محفل کا اہتمام ہوا۔ طنز و مزاح کا دور چلا۔ طلبہ سردار صاحب کی حاضر جوابی اور صاف گوئی سے بہت متاثر ہوئے۔ سردار صاحب کی طبیعت بھی مسرور ہوئی۔ اور سیلانی دیوانہ وار خوش تھا کہ آج اس کی ایک ایسی خواہش پوری ہوئی۔ جس کے پورا ہونے کی اسے توقع نہیں تھی!!

افکارِ عالیہ

پروفیسر چوہدری محمد علی
ایم۔ اے

چاند نگر کے چشمے خون اُگلتے ہیں
دریا سُوکھ گئے ہیں ساحل جلتے ہیں

جاگنے والے اشکوں کی آواز نہ سُن
آنکھ کے سورج ڈھلتے ڈھلتے ڈھلتے ہیں

یاروں نے تو کب کا ملنا چھوڑ دیا
دشمن ہفتے عشرے آن نکلتے ہیں

جانے رہنے کو شہر بھی ہیں ویرانے بھی
اُنکی گلی میں جاؤ تو ہم بھی چلتے ہیں

دل کے ہاتھوں کس نے سُکھ کا سانس لیا
دوست پریشاں حال ہیں دشمن جلتے ہیں

ہم سیلانی تم مالک ہو شہروں کے
عیش کرو۔ آرام کرو۔ ہم چلتے ہیں

اپنے بیگانے حیران ہیں مدت سے
حضرت مضطر گرتے ہیں نہ سنبھلتے ہیں

پروفیسر خان نصیر احمد خان
ایم۔ ایس سی۔

عشق و اخلاص کے مل جائیں گے پیمانے چند
اے خوشا وقت کہ پھر جمع ہیں دیوانے چند

ڈھونڈ مت وقت کے پیکر میں تسلسل کا وجود
عمرِ انساں ہے جو سچ پوچھو تو ہنگامے چند

لوٹ لی یارِ یگانہ سے بتو تم کو سلام
کعبہ آباد ہوا توڑ کے بت خانے چند

آخرِ کار جلے راکھ ہوئے خاک ہوئے
شمعِ اُمید کے باقی تھے جو پروانے چند

وہ حسیں ہوگا مگر ایسا بھی کیا ہوگا نصیر
گھر لٹے چاہنے والوں نے ہیں افسانے چند

پروفیسر چوہدری محمد شریف خالد
ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی

○

مری رندانہ جرأت ہے سزاوارِ خطا پوشی
وفورِ شوق میں آدابِ محفل بھول جاتا ہوں

نہیں پابندِ راہ و رسمِ منزل جستجو میری
نکل جاتا ہوں آگے اور منزل بھول جاتا ہوں

ڈراتی تھی مجھے موجوں سے ساحل کی سبک ساری
تلاطم آشنا ہو کر میں ساحل بھول جاتا ہوں

کسی کے جور کو اپنے کرم کو بھول جاتا ہوں
کسی کی یاد میں خود کو میں کامل بھول جاتا ہوں

میں اکثر سوچتا ہوں یہ کہوں گا اور یوں اُن سے
مگر جب پاس ہوتے ہیں دلائل بھول جاتا ہوں

حوادث نے بنایا ہے مزاج ایسا کہ اب خالد
جفاؤں میں وفائیں بھی ہیں شامل بھول جاتا ہوں

سوزِ دروں

(غزلیں)

خلیل رامپوری

(۱)

دیکھ یہ شستۂ بہارِ نَو
ہر نفس موجۂ صبا کی رَو
دے رہی ہے دُھواں چراغ کی لَو
منزلِ شب کے تھک چکے رہرو
چاندنی رات ہو کہ صبحِ نَو
اپنی تقدیر میں کہاں ہے ضَو
باغ بیت گھر سے ہو گئے خالی
سایۂ تاک ہے نہ سبزۂ نَو
جس کے دم سے ہے رنگ و بُو کا وقار
ہائے اس کے جمال کا پرتَو
دل کہ اک جادۂ اماں تھا کبھی
اب کہاں وحشتیں ہیں کی رہرو
پاسبانِ حرم کی نیت دیکھ
ہیں لگائے قبائے گُل سے لَو
جام خالی ہیں مسند پہ نشاں
ہائے یہ شانِ محفلِ خسرو

(۲)

وقت گُم سُم ہے سوچتا ہے کیا
کوئی طوفان ٹل گیا ہے کیا
آدمی کون ہے خدا ہے کیا
خود کو پہچان، سوچتا ہے کیا
گرد بیٹھی ہوئی ہے راہوں سے
قافلہ ساتھ لے گیا ہے کیا
بیٹھے جاتے ہیں کیوں در و دیوار
گھر میں سیلاب آ گیا ہے کیا
گُل کھلاؤ ہنر کے صحرا میں
ورنہ اس فن کا مدعا ہے کیا
تُو نہیں ہے تو دم نکلتا ہے
سوچتا ہوں کہ تو "ہوا" ہے کیا
وہ دبی آگ پھر بھڑک اُٹھی!
یاد بھی موجۂ صبا ہے کیا
تیرے گھر کا دیا رہے روشن
اور درویش کی صدا ہے کیا
آسماں سے ذرا اُتر کے دیکھ
تیری دُنیا میں ہو رہا ہے کیا

لطف الرحمن محمود
[illegible]

کسی کے گیسوؤں سے جب لگن محسوس ہوتی ہے!
کہ اپنے دل کے ٹکڑوں میں جلن محسوس ہوتی ہے!

جونہی آہوں کو ملتا ہے سکوں زلفوں کے سائے میں
یہی آلام کی دنیا - وطن محسوس ہوتی ہے!

خیالوں کے بگولے ناچتے پھرتے ہیں سینے میں
درونِ خانۂ دل انجمن محسوس ہوتی ہے!

نہ تو یہ غرق ہو جائے کہیں جامِ سفالیں میں
ادا ساقی کی کچھ توبہ شکن محسوس ہوتی ہے!

یہ اپنا ناتواں دل گرتے پڑتے جا پہنچتا ہے
جہاں بھی شورشِ دار و رسن محسوس ہوتی ہے!

محبت خار ہے ایسا کہ جب پیوست ہوتا ہے
تو پھر دل میں بھی میٹھی سی چبھن محسوس ہوتی ہے!

نہ ہو جائے کہیں برہم مزاجِ ہستئ موہوم
مجھے تیری جبیں پر اک شکن محسوس ہوتی ہے!

تجھے یہ کون بتلائے کہ تیری رہگذر مجھ کو
ردائے لالہ و سرو و سمن محسوس ہوتی ہے!

نگاہِ عشق کی درماندگی کو کوسنے والو!
جبینِ حسن پر بھی تو تھکن محسوس ہوتی ہے!

تسلسل اس قدر ہے دوستو کہ بے وفائی بھی
مجھے احباب کی رسمِ کہن محسوس ہوتی ہے!

خیالِ زلفِ جاناں سے الجھ کر زندگی میری
بہارِ جاوداں کا پیرہن محسوس ہوتی ہے!

پریشانی سے گھبرا کر غزل کہنے کو نکلے تھے
مگر محمود یہ رہ بھی کٹھن محسوس ہوتی ہے!

محمد اقبال اختر
سیکنڈ ایئر (آرٹس)

○

گلستاں کے دوش پہ رقصاں ہے پھر بادِ نسیم
بلبلِ رنگیں نوا! عہدِ بہار آ ہی گیا

رنگ لائی ہے تمنا آج تو بہ صدِ نصیب
ملتجی نظروں پہ دلبر کو پیار آ ہی گیا

"ہو رہا ہوں مست دیدِ چشمِ مستِ یار میں"
چشمِ ساقی سے نگاہوں میں خمار آ ہی گیا

التفاتِ چشمِ جاناں نے سکوں بخشا مجھے
اضطرابِ قلب کو آخر قرار آ ہی گیا

لاکھ چاہا حالِ دل پنہاں رہے ظاہر نہ ہو
لب پہ اُن کا نام لیکن بار بار آ ہی گیا

منور احمد حامد
فورتھ ایئر (سائنس)

○

اس مے کشی نے ہم کو اُبھارا کہاں کہاں
اس بے خودی میں تجھ کو پکارا کہاں کہاں

دیر و حرم میں کوہ میں صحرا و دشت میں
پھرتا ہوں میں نصیب کا مارا کہاں کہاں

تاروں کو تُو نے آب دی اور گُل کو رنگ بُو
میرے سوا ہے فیض تمہارا کہاں کہاں

سبزے میں، گُل میں، غنچے میں، لالہ زار میں،
بکھرا ہوا ہے حُسن تمہارا کہاں کہاں

پابندیاں تھیں لاکھ منوّر وہ آ ملے
غیروں نے ورنہ زور تھا مارا کہاں کہاں

رابطۂ احساس

کلیم اللہ خان
تھرڈ ایر (آرٹس)

اندھیرے

چاروں کھونٹ ہے گھُپ اندھیرا
دُور نگر ہے دُور ہے ڈیرا
ساتھی ساجن کون ہے میرا؟
قدم قدم پہ ٹھوکر کھائی
ہمت جب بھی ہے آزمائی

راہ بھی پُر پیچ بنی ہے
کالی سر پہ رات تنی ہے
موت سے شاید آج ٹھنی ہے
مَیں ہوں اکیلا اور تنہائی
ہمت جب بھی ہے آزمائی

خار بچھانے والی دُنیا
پیار سے ہے یہ خالی دُنیا
من کی ہے یہ کالی دُنیا
ظالم ہے بھگوان خدائی
ہمت جب بھی ہے آزمائی

ساتھی بھی مُنہ موڑ چکے ہیں
رشتے سارے توڑ چکے ہیں
بیچ بھنور کے چھوڑ چکے ہیں
شام اندھیری مجھ پہ چھائی
ہمت جب بھی ہے آزمائی

سمیع اللہ
ایم اے (اردو)

سفر

ترے جہانِ الم کا نہیں ہوں شیدائی
افق کے پار بہت دور بھاگ جانے والے
جہاں پہ مجھ کو میسّر ہو کچھ تنہائی!
وہاں پہ جا کے مجھے اپنا راگ گانے والے

ترے جہانِ الم کا یہ شورِ آہ و فغاں
کروں گا مَیں اسے برداشت کون کہتا ہے
کسے پتہ ہے کہ کیا ہے یہ میرا سوزِ نہاں
کسی کا درد یہاں آج کون سہتا ہے!

جو ہو سو ہو مجھے معلوم ہے مرا انجام
تو پھر مَیں کیوں نہ تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں؟
مجھے یقیں ہے مَیں پاؤں گا کوئی ایسا مقام
جہاں سے جا کے مَیں خوشیوں کو پھر بلا لاؤں

مجھے حیات پہ اپنی کچھ اعتبار نہیں
جو یاد آؤں تو جی بھر کے مجھ پہ رو لینا
مَیں جا رہا ہوں بظاہر گو اشکبار نہیں
مگر یہ خون کے آنسو مرے پہ رو لینا

مرا سلام مرے شام دو ستاروں سے
خبر یہ اس لئے ان کو سنا رہا ہوں مَیں
کہ ہو رہا ہوں جدا آج اپنے پیاروں سے
افق کے پار بہت دور جا رہا ہوں مَیں!

ذکر و فکر

(مقالات و مضامین)

لطیف احمد قریشی
فورتھ ایر (آرٹس)

ادب: پیدائش اور مقاصد

انسان جب منصۂ شہود پر آیا تو اپنے عظیم الشان اور پُر ہیبت ماحول کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو گیا۔ اگر ایک طرف دیو ہیکل پہاڑ اس کو حیرت زدہ کر رہے تھے تو دوسری طرف مہیب غاریں اس کو نگل جانے کے لئے منہ کھولے پڑی تھیں یہاں وہ اپنے آپ کو جھٹکا دیتے ہوئے سمندر دریا کے سامنے بے بس پاتا تو وہاں طوفان انگیز ہوائیں، بارشیں اور برق و رعد اس میں احساسِ کمتری پیدا کرتیں۔ یہی نہیں اسے اپنے سامنے اسکے خون کے پیاسے وحشی درندے بھی دکھائی دیئے۔ اگر ایک طرف اسے اپنی جان بچانے کے لئے ان قوتوں سے ٹکرانا پڑتا تو دوسری طرف اپنی خوراک حاصل کرنے کے لئے ان کو شکست دینا پڑی۔

پیدائش کے بعد انسان ایک لمحہ کے لئے بھی کہیں سکون حاصل نہ کر سکا بلکہ اپنی حفاظت کی غرض سے اور اپنے لئے خوراک حاصل کرنے کے اس نے اپنے شب و روز ایک کوشش ناتمام میں لگا دیئے۔ اسے اپنی حفاظت کے لئے انہی غاروں میں چھپنا پڑا جو اس کو ابتدا میں تو نظر آتی تھیں جب اس نے خود کو ان فطری طاقتوں کے سامنے بے بس پایا تو بے بسی کے عالم میں اپنے گرد پڑے ہوئے پتھروں اور لکڑیوں سے ہی اس نے ان طاقتوں کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ اس ماحول سے کچھ واقفیت حاصل کر چکا اور اس کے ذہن نے کچھ ترقی کی تو اس نے زمین کے سینہ کو پھاڑ کر کچھ دھاتیں ڈھونڈ نکالیں اور ان طاقتوں کو شکست دینے کے لئے ان دھاتوں سے اوزار تیار کر لیے۔

اسی طرح ترقی کرتے کرتے وہ آج کی مصروف ترین دنیا میں پہنچ گیا۔ یہاں اسے بیشمار وحشی درندوں اور فطرت کی دوسری ابتدائی زبردست طاقتوں سے تو نہیں لڑنا پڑا لیکن اسے اپنے لئے اور کئی مصائب پیدا کر لئے ہیں۔ کہتے ہیں اس نے ترقی کی ہے لیکن حال یہ ہے کہ اب وہ پیٹ بھرنے کو بھی ترس رہا ہے اور ابھی اس نے ان مادی طاقتوں سے بھی پوری طرح چھٹکارا حاصل نہیں کیا کہ اسے پھر نیا اژدہا منہ کھولے ہوئے اپنی طرف بڑھتا نظر آ رہا ہے۔ کیا وہ اب کے بھی اس کو شکست دے سکے گا؟ —

—— کیوں نہیں —— وہ انسان ہے اسے بہر حال ہر اس طاقت کو سرنگوں کرنا ہے جو اس کے مقابل آئے اور وہ واقعی

اپنی ساری قوتوں کو جمع کر کے میدان میں کود پڑتا ہے۔

ابتدا سے لیکر آج تک اسے ایک لمحہ کے لئے بھی اس سعیِ پیہم سے چھٹکارا نہ ملا اور اس کی یہ ہمیشہ خواہش ہی رہی کہ چند لمحے آرام و چین سے کسی کنجِ تنہائی میں بسر کرے وہ اس کارزارِ حیات سے مفر کے خواب ہی دیکھتا رہا — لیکن افسوس اس کے یہ خواب کبھی پوری طرح شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے!۔

اس کی یہ خواہشِ فرار بہت سی صورتوں میں ظاہر ہوئی کبھی اس نے ان طاقتوں سے صلح کی ٹھانی اور کبھی شکست تسلیم کرنے کی سوچنے لگا لیکن یہ اس کے لئے کیسے ممکن تھا۔ اسے تو بہر حال ان طاقتوں کا مقابلہ کرنا ہے اور انہیں شکست دئے بغیر چارہ نہیں کیونکہ ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ اس نے ایک اور راہ ڈھونڈی اپنے وقت کا بیشتر حصہ تو وہ ان طاقتوں کے مقابلے میں صرف کرنے لگا اور جب تھکاوٹ سے چور ہو جاتا تو وہ وقتی آرام کے ذرائع سوچتا کبھی اس نے خود کو فطرت کے حسین مناظر میں کھو دیا اور کبھی خود ایسے مناظر پیدا کئے اس کی یہ تخلیقی قوت بہت سی صورتوں میں ظاہر ہوئی اس نے اس کے لئے فنونِ لطیفہ کا سہارا ڈھونڈا۔ اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ انسان کا ذہن ترقی کی بہت سی منازل طے کر چکا ہے (بلکہ اب تو انسان اپنی تکمیل تک کو پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے) اس نے فنونِ لطیفہ کی ایک بہت ہی سلجھی ہوئی شاخ پیدا کی جس کا نام ادب رکھا۔

اس نے فنونِ لطیفہ اور خصوصاً ادب سے صرف وقتی مفر کا مقصد حاصل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کا ذہن تو ایک پنتھ دو کاج کی سوچ رہا تھا۔ اس نے وقتی مفر کے ساتھ ساتھ اس سے کشمکشِ حیات میں مدد بھی لینا چاہی اور پھر وہ اپنے دوسرے بھائی بند اور اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی اپنے تجربات حیات سے آگاہ کر کے انہیں ان خطرات سے متنبہ کرنا چاہتا تھا جو خود اس کو پیش آئے تاکہ وہ اس کی روشنی میں زیادہ کامیابی سے یہ جنگ لڑ سکیں۔ اس کے لئے اس نے ادب کو ایسے رنگ میں ڈھالا کہ وہ اسے اس پر از مصائب کشمکش سے وقتی آرام بھی دینے لگا اور ساتھ ہی کارزارِ حیات میں بھی اس کے لئے ممد ثابت ہوا۔ اس طرح ادب کی پیدائش کے یہ دو مرکزی اسباب اس کے دو مقاصد بن گئے اور ادب انسانیت کیلئے ایک نعمتِ عظمیٰ بن گئی۔

لیکن انسان کی بدقسمتی کہ تمام نعمتوں کی طرح یہ نعمت بھی تخریبی عناصر کی دست برد سے نہ بچ سکی ستم تو یہ ہے کہ یہ تخریبی عناصر بھی بعض انسان کہلانے والی ہستیاں ہی ہیں جنہوں نے اس کی کشمکشِ حیات سے مفر کی خواہش سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اسے شرابِ مشکبو کے دھوکے میں سمِ قاتل پلا دیا۔ انہوں نے انسان کی بعض اور بنیادی خواہشوں کو انگیخت کر کے انہیں حد سے بڑھا کر کشمکشِ حیات سے مفر کی ایک راہ کے طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ قانونِ قدرت ہے کہ ہر شے کی زیادتی مہلک ثابت ہوتی ہے۔ جب ان عناصر نے اس کی جنسی کمزوری سے غلط فائدہ اٹھایا اور اسے حد سے بڑھا کر پیش کیا تو ظلوم و جہول اور ضعیف انسان بھٹک گیا لیکن نام نہاد ادیبوں (میں تو اسی شخص کو ادیب کہوں گا جس کی تخلیق ادب کے دونوں مذکورہ مقاصد کو پورا کرے) نے اس کو اس فریب میں مبتلا کیا۔ کہ لطافت کی جامع ہستی صرف عورت ہے — کس قدر گمراہ کن خیال ہے! — اور آج انسان کے ذہن پر عورت کو سوار کر دیا گیا ہے۔ وہ اپنا مقصد، مرجع اور ملجا و

مادی غرضیکہ سب کچھ عورت کو سمجھنے لگا ہے اور آج ان گمراہ شدہ اور گمراہ کن ادیبوں کی کارستانیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ اگر کسی فرم کو سائیکل کا بھی اشتہار دینا ہے تو اس پر نیم برہنہ عورت ہی سوار دکھائی جاتی ہے اور جہاں چند نوجوان بیٹھے ہیں جنسی گفتگو کے سوا انہیں کوئی موضوع ہی نہیں ملتا اور اگر وہ ادب کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں تو وہاں سوائے عورت کے جسم کی تشریح اور رطب اللسانی کے کچھ بھی نہیں۔ اگر نوخیز قارئین کچھ پڑھنا چاہیں تو ہمارے ادب میں جنسیات کی کثرت ہونے کی وجہ سے ان کے لئے سوائے گمراہی کے اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ آج کی فلم انڈسٹری پر بھی عورت کے جسم کی حکومت ہے اور ان میں بھی سوائے جنسی کشش کے اور کچھ نہیں ملتا کیونکہ گمراہ شدہ طبقہ (جو کہ کثیر تعداد میں موجود ہے) سوائے اس کے کسی چیز کو قبول ہی نہیں کرتا۔ اور وہ مجبور ہیں کیونکہ ان گمراہ کن ادیبوں نے ان کے ماحول کو ہی ایسا بنا دیا ہے۔ جب وہ کشمکشِ حیات سے فرار کے لیے ادب کی جانب دوڑتے ہیں تو وہاں انہیں بجائے راحت و تسکین کے اور کوفت بخش دی جاتی ہے ——

اُف کیسی قابلِ رحم حالت ہے!

آج حقیقی انسان (کیونکہ جنسی طور پر پامالی ہستی انسان کہلانے کی حقدار نہیں) ہر طرف سے مایوسی کے سایوں کو بڑھتا ہوا محسوس کر رہا ہے اسے اپنا بدترین انجام سامنے نظر آ رہا ہے لیکن کیا اسے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے؟ ——

ہرگز نہیں۔ وہ انسان ہے انسان! اس نے شکست تسلیم کرنا نہیں سیکھا۔ بلکہ وہ تو ازل سے فاتح پیدا ہوا تھا اور اس نے خوفناک عناصرِ اربعہ کو شکست دے کر یہ بات ثابت بھی کر دی ہے اس لئے وہ یقیناً اس لطافہ ہر بلائے بے درماں کا بھی ضرور کوئی علاج ڈھونڈ لے گا اور پھر یہ مصیبت تو خود اس کی اپنی پیدا کردہ ہے بیشک مکان کا ڈھانا آسان ہوتا ہے اور بنانا بہت مشکل لیکن وہ پیدا ہی اس لئے ہوا ہے کہ مشکلات پر قابو پائے اور مصائب کو شکست دے وہ یقیناً اسے شکست دے دیگا اور دنیا دیکھ لے گی کہ ان گمراہ کن ادیبوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ہمارے صحت مند ادیبوں کو چاہیئے کہ وہ آگے آئیں اور دنیا کو دکھا دیں کہ ادب تعمیری ہوتا ہے تخریبی نہیں! ادب جنسیات کا نام نہیں بلکہ وہ اس سے اعلیٰ کوئی اور شے ہے۔

"یہ تمہاری تہذیب اور اس کی رسمیں اور بھڑک چمک یہ آداب اور تکلفات سب ایک دھوکا اور ڈھکوسلا ہیں۔ یہ تم کو آدمی نہیں بنا سکتے بلکہ اگر تم آدمی ہو بھی تو تمہیں گڑیا اور گڈے بنا دیں گے —— آدمی کی شان تو اس میں ہے کہ اپنے آپ کو پہچانے اور اپنی قدر کرے اور تہذیب کے بہروپ اور زندگی کے بہروپ اور زندگی کے ہر اس قاعدے کو جو اسے آدمی بننے سے روکتا ہو اسے مٹا دے۔" (روسو)

"عظیم ترین صداقتیں انتہائی سادہ ہیں اور یہی خاصیت عظیم ترین انسانوں کی ہے۔" (اے۔ ڈبلیو۔ ہیئر)

"اگر شاعری انسانی ذہن میں درختوں کے برگ و بار کی طرح پیدا نہ ہو تو وہ شاعری نہیں لعنت ہے۔"

(کیٹس)

مرزا محمد الیاس
(آرمش)

اقبال کی شاعری میں مناظرِ فطرت

شاعری انسان کے نازک جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ اور ان جذبات کے اظہار کے لئے شعراء نے حسنِ فطرت سے امداد حاصل کی۔ آخر سرو کی قامت، پھول کی نزاکت، شبنم کی روح پرور خنکی اور چاند کی حسین چاندنی سے کون واقف نہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے اساتذۂ فن سودا، ذوق اور انیس و دبیر وغیرہ نے جا بجا مناظرِ فطرت کو اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور انہیں شعر کی لڑیوں میں پرو دیا۔ لیکن اگر ہم اپنی عقیدت سے بالا ہو کر ان شعراء کے کلام کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو ثابت ہوگا کہ انہوں نے فارسی کی اندھی تقلید سے کام لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو شاعری کے ارتقاء میں فارسی کو بڑا دخل رہا ہے۔ حتیٰ کہ اردو شاعری کی مروج بحریں تک فارسی سے لی گئی ہیں لیکن فارسی کی اتنی زیادہ تقلید کہ اس کے مضامین پر بھی اردو شاعری کا سنگِ بنیاد رکھا گیا قابلِ اعتراض ہے! فارسی شاعری کی اندھی تقلید کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری سے اصلیت مفقود ہو گئی۔ جہانگیر کے عدل کی تعریف کرنے کے لئے اسکا نوشیرواں کے عدل سے مقابلہ کیا جاتا۔ بہادری کے لئے رستم و اسفندیار کی مثال دی جاتی اور سخاوت کے اظہار کے لئے حاتم کا نام لیا جاتا۔ یہی تقلید کا اثر فطرت کی منظر کشی پر بھی پڑا۔ ہندوستان کے مرغزاروں، ہمالہ کی بلندیوں اور گنگا جمنا کی وادیوں کی بجائے ایران کے کوہ بیاباں، کوہ الوند کی بلندی اور جیحوں سیحوں کی طغیانی کا ذکر کر کے حسنِ فطرت کو غیر فطری رنگ دیا جاتا۔

اقبال نے سنجیدگی سے اس طرف توجہ کی۔ افکار کو تقلید سے آزاد کیا، حسنِ فطرت کے اظہار کو تصنع سے پاک کیا اور اردو شاعری میں اپنے ماحول کے مطابق منظر کشی کی۔ کوہ الوند و بے ستون کی بلندیوں کے گن گانے کی بجائے اس نے ہمالہ کی عظمت کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ ایران کے مرغزاروں اور سبزہ زاروں کا ممنونِ احسان ہونے کی بجائے گنگا جمنا کی پربہار وادیوں کی تصویر کشی کی اور یوں نیچرل شاعری میں بھی اس نے جذبۂ حبِّ وطن کا اظہار کیا۔

بعض لوگ اقبال کی نیچرل شاعری کا ورڈز ورتھ (Words worth) کی نیچرل شاعری سے موازنہ کرتے ہیں اور ورڈز ورتھ کے اندازِ بیان اور طرزِ ادا کو زیادہ دلکش قرار دیتے ہیں لیکن وہ تقابل میں یہ حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ورڈز ورتھ کی شاعری کا بنیادی نظریہ ہی فطرت کو حسین اور پاکیزہ ثابت کرنا تھا۔ مگر اقبال کا مطمحِ نظر اس سے کہیں آگے تھا۔ جس زمانہ میں وہ پیدا ہوا وہ ورڈز ورتھ کی سی فارغ البالی اور خوشحالی کا زمانہ نہ تھا بلکہ قوم کی مادی اور روحانی بے حسی کا زمانہ تھا۔ اقبال کا منتہائے نظر اپنے اشعار سے قوم کے تنِ مردہ میں زندگی کی روح پھونکنا تھا۔ حسنِ فطرت کی منظر کشی تو اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھی۔ اقبال کے کلام "بانگِ درا" میں نظم "ہمالہ" جہاں فطرت کی منظر کشی کرتی ہے وہاں وطن پرستی کے جذبات سے بھی لبریز ہے۔ اس سلسلے میں یہ مثال کافی ہوگی ؎

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے جھک کے پیشانی کو تیری آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن

بوٹیاں تیری تمنا سے ہیں سرگرم سخن
تو زمیں پر اور ایسا ہے فلک تیرا وطن

مختصر یہ کہ اقبال نے حسنِ فطرت کی تصویر کشی میں حب الوطنی کا جذبہ ملحوظ رکھا ہے۔

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبال نے حسنِ فطرت کی منظر کشی میں بھی اگر اپنا فلسفہ سمویا ہے تو کیا اس سے منظر کشی پر فنی اور ادبی لحاظ سے کوئی اثر تو نہیں پڑا اور کیا اس کی مقصدیت اس کے کلام میں فنی لحاظ سے رو کر تو ثابت نہیں ہوتی۔ اس سوال کا جواب نفی میں سمجھنا چاہیئے کمالِ فن یہ ہے کہ جس منظر کا ذکر کیا ہے اس کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے اور اس تصویر کو نازک تشبیہات اور اچھوتے اندازِ بیان نے چار چاند لگا دیئے ہیں مثلاً نظم "ایک آرزو" میں رقمطراز ہیں ؎

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لیے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو - نالا مری دعا ہو

یہ اشعار اقبال کے کمال کا ثبوت ہیں۔ ندی کے کنارے کے درختوں کا جو عکس پانی پر پڑتا ہے اسے کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے! پھول کی ٹہنی کے سطحِ آب پر جھکنے کو ایک حسین کے آئینہ دیکھنے سے تعبیر کیا ہے تو نزاکتِ تشبیہ کی معراج ہے غروبِ آفتاب کے وقت شفق کی سرخی کو عروسِ شام کی مہندی سمجھنا اور صبح کے وقت پھول پر پڑی ہوئی شبنم کو آبِ وضو قرار دینا اقبال ہی کا کام ہے اسی طرح نظم "ماہِ نو" میں سورج کے غروب ہونے، شفق کے پھوٹنے اور چاند نکلنے کے نظارے کو یوں بیان کیا ہے ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب
نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

ان اشعار میں استعمال شدہ تشبیہات اقبال کی بلندیٔ تخیل اور کمالِ فن کی غماز ہیں۔ نظم "کنارِ راوی" میں شفق کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؎

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو کیفیت ہے میرے دل کی
شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لیے ہے پیرِ فلک دستِ رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روزِ تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا

باغ کی دل نوازی کی تصویر نظم "حسرتِ دیدار" میں یوں کھینچی ہے ؎

اشجار جھومتے ہوں شاخیں لچک رہی ہوں
خوشبو ہو بھینی بھینی۔ کلیاں مہک رہی ہوں
شبنم کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی ہوں
سبزے پہ موتیوں کا پانی چھڑک رہی ہوں
مصروف آہ ہم تم گل گشتِ باغ میں ہوں
دامن میں پھول جیسے گنجِ فراغ میں ہوں

ایک جگہ "گلِ پژمردہ" سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ؎

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں
کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں
تھی کبھی موجِ صبا گہوارۂ جنباں ترا
نام تھا صحنِ گلستاں میں گلِ خنداں ترا
تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

دیکھی آپ نے تمنائے دلِ بلبل۔ گُلِ خنداں اور قطرۂ شبنم کے الفاظ نے ایک پُر بہار باغ کی کتنی خوبصورت تصویر کھینچ دی ہے ان امثال سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کو منظر نگاری میں کمال حاصل ہے

اقبال فطرت کی منظر کشی کو کس انداز سے اپنے فلسفہ سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ انداز بجائے خود ایک فن ہے "ساقی نامہ" کی ابتدا بہار کے رنگین موسم کا تصور پیش کرتی ہے۔ ؎

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

اس تصور میں بھی اقبال کی شاعری کے بنیادی نظریہ یعنی حرکت ارتقا کا عمل جاری ہے یہاں تک کہ بہار کی تصویر ندی کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی۔ ؎

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ملاحظہ فرمایئے اس آخری شعر میں کتنا عظیم الشان سبق پنہاں ہے یہی نہیں بلکہ پہاڑوں کے دل چیر دینے والی ندی انسان کو ایک پیغام دیتی ہے۔ ؎

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

نظم "لالۂ صحرا" میں فرماتے ہیں ؎

یہ گنبدِ مینائی یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

یہاں پہنچ کر اقبال اپنے جذبات کے دھارے کو بے مقصد نہیں بہنے دیتا بلکہ کہتا ہے ؎

بھٹکا ہوا راہی میں بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی اک لذتِ یکتائی
اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دلسوزی سرمستی و رعنائی

اقبال کے نزدیک مناظرِ فطرت محض ذہنی تسکین یا عیاشی کا سامان نہیں بلکہ دیکھنے والی نگاہ ان میں بہت کچھ دیکھتی ہے ؎

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں

نظم "مسجد قرطبہ" میں شام کے وقت کی منظر کشی کرتے ہوئے وہ خیالات کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کے خیالات کی رو ان کے تصور کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے ؎

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُرسوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب!

اقبال نے ان مناظرِ قدرت کے دھیان جو خواب دیکھا تھا

طنز و مزاح

ایل - ایم - اسعد
(سائنس)

"مقررین کی قسمیں"

(مباحثوں سے متاثر ہو کر ——— مقررین سے معذرت کے ساتھ)

اچھا صاحب مجھے یہ تو بتایئے کہ آپ نے آج تک کتنے مباحثے سنے — ؟ تین چار نہ سہی ایک آدھ میں تو کان صاف کئے ہی ہوں گے۔ اگر آپ ذرا فراخ دل واقع ہوئے ہیں تو یقیناً داد و تحسین کے ڈونگرے بھی برسائے ہوں گے ——— جی ہاں! اُن مقررین کی تمثیلی راقم الحروف اقسام بیان کرنے لگا ہے!

آپ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ مقررین اور پھر ان کی قسمیں؟ بات کچھ بے جوڑ سی ہے۔ ابھی ضرور کہیے لیکن پہلے میری بھی سُن لیجیے جس طرح جنس اور صنعت کی کئی قسمیں ہیں بالکل اسی طرح یادش بخیر ——— مقررین کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اور یہ ایسی واضح اور عیاں ہیں کہ راقم الحروف قسمیں کھا کر بیان کر سکتا ہے ———!

علم جغرافیہ کی رُو سے تو کسی علاقے کو سطح مرتفع اور مانسونی بارشوں وغیرہ کے لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے مگر یہاں معاملہ دوسرا ہے لباس کی سجاوٹ، چہرے کی تراوٹ، بالوں کی بناوٹ، ناز نخرے اور پھر کچھ تقریر کے حصے بخرے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں مشاہدات و تجربات کی بنا پر مقرروں کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مقررین تو مقرر ہی ہیں۔ مدرسے کا مال تو ہے نہیں کہ اس کی تقسیم پر سر پھٹول شروع ہو جائے۔ اگر آپ کا جی چاہے اور اپنے تجربے کے مطابق چار، پانچ، دس جتنی مرضی ہو قسمیں گھڑ لیجئے ——— اس میں خطرے کی کوئی بات نہیں ——— مقرر اگر ہمیں اسٹیج پر کوسیں گے تو ہم انہیں انشاءاللہ یہاں کاغذ میں رگید دیں گے!!

(۱) طوطے :۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ مقرر خود یا بقدر "طوطا چشم" ہوتے ہیں یا طوطوں کی طرح ٹیں ٹیں کرنا ان کا وطیرہ ہوتا ہے۔ بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ ایسے مقرر بڑے معقول اور با مروت ہوتے ہیں۔ یہ نام تو ایک اور خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ یہ صفت ابھی ہر مقرر میں بحصہ رسدی پائی جاتی ہے۔ اس صفت کو عام فہم اصطلاح میں ہم "رٹّا" کہہ سکتے ہیں۔ آپ میں کئی ماشاءاللہ تجربہ کار بھی ہوں گے۔ خدا لگتی کہیے رٹا لگائے بغیر اس عمر میں گزارہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ویسے بھی "ماہرین تعلیم" کی رائے یہی ہے کہ رٹا ہر نتھو خیرے کے بس کا روگ نہیں۔ اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو صاف محسوس ہو کہ رٹا ایک فن ہے ——— ایک عظیم فن! ہر مباحثے میں تبرک کے طور پر دو تین مقرر ہی ایسے ہوتے ہیں جو فی البدیہہ تقاریر کرنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں یا ان کو اس فن پر اس حد تک عبور حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس "کاوش" کی پردہ پوشی کرنے پر قادر ہوتے ہیں ——— ورنہ اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ لکھے موسیٰ پڑھے خدا والا معاملہ ہوتا ہے۔ راقم الحروف رٹا لگانے والے بزرگوں کی نسبت رٹے کی پردہ پوشی کرنے والے فرشتے کا زیادہ قدردان ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس میدان کے شہسوار انگلیوں کیا ہاتھوں یا پیروں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ طوطی بولنے کی بجائے ان کا ٹیپا ہی بول جاتا ہے۔

جوشِ خطابت میں کچھ ایسے کھو جاتے ہیں کہ اُن کا "شعور" لاشعور ہو جاتا ہے اور ان کا اندازِ بیان بے تُکی کھا رہا ہوتا ہے کہ ——— جنابِ میاں مٹھو نے خوب چُوری کھائی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک فاضل مقرر صاحب نے اپنی تقریر کا گلا اس فقرے پر گھونٹا ——— "بس صدرِ والا! میں مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں قرار داد زیرِ بحث کی پُر زور مذمت کرتا ہوں" اور سُننے والے بھانپ گئے کہ "مندرجہ بالا" کا اشارہ "چُوری" کے "بورے" کی طرف ہی ہے!

---

(۳) لطیفے: مقررین کی یہ قسم بہت ہی البیلی ہوتی ہے۔ ان کا کام ٹرافی سے "وصل" تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ان کا مقصد ہی ہنسنا ہنسانا ہوتا ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ ان کا وجود باوجود "رحمتِ غیر مترقبہ" سے کم نہیں۔ اور ایسے عالم میں جبکہ کئی مقررین اپنی قابلیت کے زعم میں "بوریت" کے جراثیم چھوڑ چکے ہوتے ہیں! ان "جراثیم کُش" مقرروں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جراثیم کش نوعیت کی تقاریر کا مطلب یہ نہیں کہ ایوان میں فنائل یا ڈی ڈی ٹی کی بُو پھیل جاتی ہے بلکہ ایوان تو قہقہوں کا جیتا جاگتا زعفران زار بن جاتا ہے!! مگر افسوس ہے کہ یہ مقرر بھی معدوم پرندوں یا جانوروں وغیرہ کی طرح ——— کمیاب بلکہ نایاب ہی ہیں! مگر اللہ میاں کی دین ہے کہ ہر کالج میں ایک آدھ مقرر موجود ہوتا ہے ——— یا پھر موجود رہتا ہے!!

مگر میرا تو یہی مشاہدہ ہے کہ اب ہر مقرر لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کے لئے چو پیچ کھو لینے پر آمادہ ہوتا ہے ——— اور انجام غالب کے اس شعر

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی!

سے عیاں ہے! یوں سمجھنا چاہیئے کہ تقریر کرنے کا انداز ہی کم و بیش یہی ہوتا جا رہا ہے۔ مقرر بڑے ناز سے کئی بل کھا کر سیٹ سے اُٹھتا ہے۔ بلکہ پہلے تو سیٹ سے "اکھڑتا" ہے اور پھر اُٹھ کر اسٹیج کی طرف کشاں کشاں بڑھنے لگتا ہے۔ اسٹیج پر جلوہ گر ہونے کے بعد ذرا "پوز" بنایا جاتا ہے۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھینچ تان کر لائی جاتی ہے۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے کے بعد گردن کو ٹیڑھا کرتے ہوئے ہر مقرر یہ فقرہ ضرور کہتا ہے ——— "صدرِ محترم! ابھی ابھی جو مقرر اُس طرف سے آئے تھے ——— تو انہیں دیکھ کر مجھے یہ لطیفہ یاد آیا ———" مقرروں کی رگیں مقرر ہی جانے! ایک دوسرے کی حالتِ زار دیکھ کر انہیں کوئی نہ کوئی لطیفہ ضرور سوجھتا ہے۔ خیر یہ افتتاحی جملہ کہنے کے بعد وہ گردن سیدھی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب ٹائی کی "ناٹ" پر بھی ہاتھ پڑے گا جو وہاں سے کھسک کر سامنے چہرے پر حرکت کر کے کریم، پوڈر کے اثر کا جائزہ لیتا ہے! انجام کار گردن سیدھی ہوتی ہے مگر "کششِ ثقل" کی وجہ سے وہ بے چاری دوسری طرف لڑھک جاتی ہے ——— اور اسی قابلِ رحم حالت میں وہ اپنا "لطیفہ" پڑھتا ہے!!

کئی لطیفے تو واقعی بڑے با موقع ہوتے ہیں مگر کئی تو مقررین کی طرح نرے یتیم ہی ہوتے ہیں۔ اور اس حرکت پر سخت غصہ آتا ہے اتنے تکلیف دہ تکلف کے باوجود اس اذیت پر کسی بد ذوق کا گولی مارنے کو بھی نہ چاہتا ہو گا! میں عرض کر رہا تھا کہ کئی لطیفے بڑے بوسیدہ ہوتے ہیں۔ اسی سلسلے میں آپ نے وہ قصہ تو سُنا ہو گا کہ کسی تیلی نے ایک جاٹ کو کہہ دیا "جاٹ رے جاٹ تیرے سر پہ کھاٹ!" مگر وہ جاٹ خلافِ معمول حاضر جواب واقع ہوا تھا اس نے جھٹ جواب دیا "تیلی رے تیلی تیرے سر پہ کولہو" پاس ہی کوئی دل جلا نقاد بیٹھا تھا فوراً اچھلا ——— "آداب عرض! قافیہ ردیف ٹھیک نہیں ہے" ——— جاٹ نے جواب دیا "اگر جان کی ضرورت ہے تو یہ آداب واداب اپنے پاس ہی رکھو۔ تمہیں پتہ نہیں کہ آزاد شاعری کا زمانہ ہے۔ قافیہ ردیف جائے بھاڑ میں۔ جب تیلی کو کولہو اٹھانا پڑے گا تو چودہ کیا پندرہ طبق روشن ہو جائیں گے" ———

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ مراد یہ ہے کہ گھسے پٹے ڈھنگ اور بوسیدہ لطیفے محض غریب سامعین پر کوہِ الم ڈھانے کے مترادف سمجھے جاتے ہیں مگر پیشتر اب بھی ایک عذاب ہیں۔ اور یہ لوگ کے شرفا تو دوسرے شہروں کے سامعین سے ذرا مختلف ہیں جو اس قدر "رقیق القلب"

واقع ہوئے ہیں کہ پھر بھی مُسکرا کر کھسیانے مقرر کی لاج رکھ لیتے ہیں!

"لطیفہ" قسم مقررین محفل اُلٹنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے سینے جرأت سے بھرپور ہوتے ہیں! ہر فقرہ قہقہہ، ہر دلیل شگوفہ! سچ تو یہ ہے کہ مجھے ایسے ہی مقرروں کی تقریریں اکثر یاد رہتی ہیں — گزشتہ سال ایک مقرر نے اپنی تقریر کا اس فقرے پر اختتام کیا — "بس صدرِ محترم! میں اس قرارداد کی مذمت کرتے ہوئے دلائلِ قاطعہ، براہینِ ساطعہ اور افکارِ نیرہ کے بحرِ بیکراں میں حزبِ موافق کے مقررین کا بیڑہ غرق کرتا ہوں"!

اور پھر اسی سال اسی مقرر نے کہا:-

"صدرِ محترم اگر حزبِ موافق انسان کا
مستقبل روشن بتاتی ہے تو میں اپنے خصوصی
اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے اُسے
دائرۂ انسانیت سے خارج کرتا ہوں"!

---

(۳) "پوزی":- چونکہ یہ لفظ آج ہی اُردو لُغت میں شکریہ کے ساتھ داخل کیا گیا ہے۔ اس لئے وضاحت ضروری ہے۔ جن مقررین کا کام صرف "پوز" بنانے کے بعد "ڈانس" کرنا ہی ہوتا ہے انہیں "پوزی مقرر" کہا جاتا ہے۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ایسے مقررین ایک قسم کی شدید خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خدمت میرے نزدیک یہی ہے کہ ان کا نفسیاتی تجزیہ کروانا چاہیئے۔ بہترین صورت یہی ہے کہ تقریر کرنے سے پہلے یا بعد ان حضرات کو مینٹل ہسپتال کی زینت بنایا جائے۔! "ایسا کرنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا!!"

بہرحال ان حضرات کی دیرینہ خواہش یہی ہوتی ہے کہ اُن کی کسی جہاندیدہ ترین انگڑائی کا جادو فوٹوگرافر پر بھی اس طرح چلے کہ بے چارے کا فوٹو لئے بغیر گزارہ نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ایوان کو خوشی خطابت میں "ہیرو" سمجھنے لگتے ہیں!

راقم الحروف کا محتاط اندازہ ہے کہ یہ حضرات "پوز سازی" یعنی عشوہ طرازی کی ریہرسل کر کے آتے ہیں۔ ایک دفعہ راکٹ کا موضوع زیرِ بحث تھا تو میرے ایک دوست نے اس طرح بازو پھیلائے کہ گمان ہوا کہ بس راکٹ "اُڑا" چاہتا ہے!! بھلا ایسا وحشت انگیز منظر دیکھ کر کس کے پیٹ میں گُدگُدیاں نہ دوڑی ہوں گی؟ ویسے بھی "پوز سازی" ایک آرٹ ہے۔ جس طرح جہاز سازی، ظروف سازی — مثلاً اوّل الذکر تو فنونِ لطیفہ میں شامل ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے یہ صحافت ہماری ثقافت اور کلچر کی جان ہے!!

مگر کئی بار پوز بناتے بناتے بات بگڑ جاتی ہے اور پھر بنائے نہیں بنتی! اس پوز سازی پر اعضائے مجلس کا بھی کچھ اثر ہوتا ہے۔ کبھی مقررین پہ "اضطراری حالت" میں خود رفتگی اور رقت سی طاری ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر تصویر کش حضرات سے "تصویر" کھنچ جائیں تو اُن کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس معاملہ میں میری ساری ہمدردیاں انہی کے شاملِ حال ہیں۔ وہ ناراض ہونے میں حق بجانب ہیں — دُور سے آئے۔ ہفتہ بھر ریہرسل کی۔ اس گرانی کے دور میں کریم، پوڈر اور لپسٹک پر فضول خرچی کی اور لا تب جا کے کہیں پوز بنا! اور وہ بھی اگر آپ کو پسند نہ آئے تو ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر میرا بس چلتا تو میں ایسے مقررین کو لے کر کسی عجائب گھر میں بطور "تبرک" بند کروا دیتا!

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آپ ان مقررین کو ٹرافی دے دیں۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اگر سارا کالج تک شاپ انہیں پلاٹ اور ٹیوب ویل سمیت ایک گٹھڑی میں باندھ کر ان کے سر پہ لاد دیا جائے — تب بھی وہ خوش ہونے کے نہیں۔ انہیں تو صرف "اسٹائل" کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ انکا مقصود صرف "پوز" کی نمائش ہے انہیں تو چاہیئے انعام یا ٹرافی نہیں!!

کئی "پوز" تو واقعی ایسے قیمتی ہوتے ہیں کہ اُن کے ضائع ہونے کا بڑا رنج و قلق ہوتا ہے۔ ان تصاویر کے ضیاع کی وجہ سے ملک کے "تجریدی آرٹ" پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ بُرا اثر کیا اس کی جان پر بن جاتی ہے۔ بلکہ ایسی تصاویر تو جناب چغتائی کے پاس بھیجی جانی چاہئیں۔ کیونکہ جنہیں وہ نقشوں میں بگاڑتے ہیں وہ یہاں نقشوں میں بن جاتی ہیں!!

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

فاروق احمد
(سائنس)

بزمِ ابلیس

(چرخِ کبود کے کسی نامعلوم گوشے میں ابلیس ایک عظیم الشان مسند پر اپنے پورے شیطانی جاہ و جلال کے ساتھ رونق افروز ہے۔ اس کے ساتھ والی مسند پر اس کا مشیر خاص متمکن ہے۔ اور ان دونوں کے بالمقابل نصف دائرے کی شکل میں ابلیس کے متعدد مشیر بڑے ادب اور احترام سے بیٹھے ہوئے ہیں)

ابلیس۔ میرے دوستو اور ہمدردو! ہمارا آج یہاں جمع ہونے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی گزشتہ سرگرمیوں کا جائزہ لیں اور غور کریں کہ ہماری آئندہ ترقی کے کیا امکانات ہیں۔ اسلئے بہتر یہی ہو گا کہ آپ میں سے ہر ایک باری باری اپنی کارگزاری سے ہمیں مطلع کرے۔

پہلا مشیر۔ (ابلیس سے مخاطب ہو کر) حضور! یہ خادم آپ کا ادنیٰ ترین خادم ہوں۔ اور مجھے بجا طور پر فخر ہے کہ آپ کے نمک حلال خادموں میں شمار کیا جاتا ہوں۔ میری ساری عمر بنی نوعِ انسان کے اندر مفاد پرستی، حرص اور خود غرضی کا جذبہ پیدا کرنے میں گزر رہی ہے۔ یہ میری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج انسان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے مفاد اور مطلب کی خاطر اپنے عزیز ترین دوست کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ وہ اپنی ضرورت کو دوسروں کی ضرورت پر مقدم رکھتا ہے۔ وہ اپنی معمولی سے معمولی غرض پوری کرنے کی خاطر دوسروں کو عظیم نقصان پہنچانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور آج انسان کی حالت یہ ہے کہ اس کی حرص کی کوئی انتہا نہیں۔ امیر غریب کی مدد کرنے کی بجائے اس کا خون چوس کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ انسان دولت حاصل کرنے کے لئے اپنے ایمان تک کو فروخت کر دیتا ہے۔ اس کا دین، اس کا ایمان، اس کی دنیا اور اس کا سب کچھ روپیہ کے لالچ سے خریدا جا سکتا ہے۔ حضور مجھے حقیقی اطمینان ہے کہ ہماری مشترکہ کوششیں ہمارے ترقی کے مستقبل کو روشن تر بنا دیں گی۔

ابلیس۔ تمہارے بیان میں صداقت اور وفاداری کی بو پائی جاتی ہے۔

مشیر خاص۔ حضورِ والا! میں بھی دیر سے یہی سوچ رہا ہوں۔ مجھے علامہ اقبال کا یہ شعر اس موقع پر غیر معمولی طور پر حقیقت پسندانہ لگ رہا ہے۔ ع

کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

دوسرا مشیر۔ (ابلیس سے) حضورِ عالی وقار! میں گزشتہ کئی برسوں سے اشرف المخلوقات کے درمیان حسد اور بغض کی آگ بھڑکا رہا ہوں اور مجھے اس سلسلے میں غیر متوقع کامیابی ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج انسان کسی دوسرے کی ترقی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھ نہیں سکتا۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا شخص اس سے ترقی کر جائے۔ اس کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ باقی تمام انسان اس سے بھی بدتر زندگی بسر کریں۔ آج میری کوششوں کے نتیجے میں انسان بہو حاجت سے کوسوں دور پہنچ چکا ہے۔ دینی معاملات کی انجام دہی کے وقت وہ خود کو بچانے کی خاطر دوسروں پر شدید قسم کے

الزام لگاتا ہے اور اپنی اصلاح سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ آجکل لیڈروں کا فقدان ہے اور عوام کے ایماندار بکثرت پائے جاتے ہیں۔

حضور عالی مقام آج میری جد و جہد کا نتیجہ بالکل واضح ہے۔ انسانوں میں باہمی منافرت اور عداوت گھر کر چکی ہے اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں بکثرت موجود ہیں اور حضور کی نیک نامی اور شہرت کا باعث ہیں۔

ابلیس۔ ہماری رائے میں تمہاری کارکردگی لائق صد ستائش ہے۔

مشیر خاص۔ میرا خیال بھی حضور کی رائے کے ساتھ باہمی سمجھوتہ کرنے پر رضامند نظر آ رہا ہے۔ حضور علامہ اقبال نے بھی درست ہی فرمایا تھا۔ ؎

جس کی شاخیں ہوں ہماری آبیاری سے بلند
کون کر سکتا ہے اس نخلِ کہن کو سرنگوں

ابلیس۔ (مشیر خاص سے) ہم ان دونوں کے حسنِ عمل سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آئندہ یہ اپنے آپ کو اس سے بھی زیادہ اہم کاموں کی انجام دہی کا اہل ثابت کریں گے۔ اب ہم اپنے تیسرے مشیر کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنے طریق کار کی وضاحت کرے۔

تیسرا مشیر۔ حضور والا! میں نے آپ کے سب سے بڑے دشمن یعنی مسلمان کو گمراہ کرنے کا فرض ادا کیا ہے۔ میں نے مسلمانوں میں کئی فرقے پیدا کئے اور ان کی طاقت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ میں نے ان میں معمولی معمولی باتوں کا اختلاف پیدا کیا۔ ان کو ہمیشہ کے لئے نا ختم ہونے والے جھگڑوں میں لگا دیا۔ میرے اکسانے پر انہوں نے کلام الٰہی کو ترک کر دیا جس کے نتیجے میں وہ غیر شرعی مسائل اور خود ساختہ رسوم کے پیچھے پڑ گئے۔

مشیر خاص۔ (تیسرے مشیر کی بات کاٹ کر) تمہارے کارناموں کی روشنی میں میرے لئے اس شعر کا سمجھنا چنداں مشکل نہیں رہا۔ ؎

کیا مسلماں کے لئے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات

ابلیس۔ (تیسرے مشیر سے) ہم تمہاری باتوں سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔ تمہیں اپنی گفتگو جاری رکھنی چاہیئے۔

تیسرا مشیر۔ حضرت یہ میری ہی حکمت عملی کا نتیجہ تھا کہ بغداد سے مسلمانوں کی شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا۔ جس وقت ہلاکو خاں بغداد پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا بغداد میں شیعہ اور سنی کے فسادات فقط عروج تک پہنچ چکے تھے۔ انہیں اپنے وطن کی حفاظت کے لئے عوام کو متحد کرنے کا خیال تک نہ تھا۔ انہیں اس بات کا احساس اس وقت ہوا جبکہ ہلاکو خاں انکے گھروں میں داخل ہو چکا تھا لیکن اس وقت کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہو سکی۔ بغداد کو ہولناک تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ساتھ ہی مجھے بھی اطمینان کا سانس نصیب ہوا۔

میرے آقا! معمولی سے اختلافات کی بنا پر میں نے مسلمانوں کو اس قدر نقصانات پہنچا دیئے کہ وہ آج تک ان کی تلافی نہیں کر سکے۔

ابلیس کا تیسرا مشیر اتنا کہنے کے بعد خاموش ہو گیا۔ ابلیس اپنی مسند سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے کچھ کہنے کی بجائے فاتحانہ انداز سے ناچنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ ایسی چمک جو کہ انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔ ابلیس رقص کرتا رہا اور اس کے مشیر اس کے حق میں پُرشور نعرے بلند کرتے رہے۔ نظامِ آسمانی میں ایک عجیب سی ہلچل مچی رہی۔ اسی دوران میں آسمان کے بالائی طبقات سے ایک شعلۂ نورانی نمودار ہوا اور ابلیس کی مجلس کے عین درمیان میں آ کر گرا۔ ابلیس کی ساری مجلس درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

حنیف صدیقی
(ساحلی)

"کب ایسے لوگ ہوتے ہیں پیدا جہاں میں؟"

(کردار فرضی ہے۔ کسی قسم کی مطابقت اتفاقی ہی ہو سکتی ہے۔ مضمون نگار اور ادارہ ذمہ دار نہیں!)

النادی کی وساطت سے آپ اب تک نہ جانے کتنی عجیب و غریب شخصیتوں سے غائبانہ طور پر متعارف ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک میرے ایک عظیم دوست "تعارف" کی زد سے محفوظ ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ ایک ایسی ہستی سے متعارف ہوئے بغیر ہی اس دنیائے فانی سے گزر جائیں جو دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہلانے کا مستحق ہے۔ مختصر یہ اگر آپ سے ان کے متعلق پوچھا جائے تو پھر وہاں آپ کیا جواب دیں گے؟ چونکہ "سارے جہاں کا درد میرے جگر میں ہے" —— اسلئے میں نے ان کے مناقب عالیہ پر روشنی ڈالنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان سے مل کر آپ کو وہی روایتی مسرت ہوگی یا میری طرح شدید کوفت ہی آپ کے مقدر میں بھی ہے! لیکن یہ میرے دل کی آواز ہے کہ ان سے رسم و راہ پیدا کئے بغیر اس دنیا میں زندہ رہنا مرجانے کے مترادف ہے۔ اور پھر مرجانا ایک بہت بڑی محرومی ہے یوں تو ہر دیس میں عجیب و غریب انسان اور حیوان رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن میں اپنے عظیم دوست کو دیکھ کر اکثر ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہوں کہ ع

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی؟

اب میں آپ کو مزید انتظار میں رکھنا نہیں چاہتا! وہ دیکھیے موڑ پر ایک انسان نما جانور حرکت کر رہا ہے —— حرکت کیا یوں کہیے کہ رینگ رہا ہے۔ بڑے بڑے "مفکروں" کا قول بلکہ تجربہ ہے کہ —— "ہیٹ" اور عینک یا تو انسان کی معقولیت میں اضافہ کر دیتی ہے اور یا پھر "ابتر" کا موجب ہوتی ہے اسلئے قریشی صاحب —— ان دونوں چیزوں کے دلدادہ ہیں۔ نتیجہ دونوں کمبختوں نے ان کی معقولیت کا ستیاناس کر دیا ہے —— ! ماشاءاللہ اچھے بھلے آدمی ہیں —— ناک نقشہ اگرچہ کرخت ہی ہے لیکن پھر بھی عادات و اطوار "زمانۂ جاہلیہ جدید" کہنا زیادہ موزوں ہے! ایسا کیوں ہے؟ —— کوئی ماہر نفسیات ہی اس گتھی کو سلجھا سکتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ شخص ہے بڑی پُر اسرار ——!! جوں جوں یار لوگ اس طرح پر پیچ کے خم کھولتے ہیں توں توں نئے نئے "معارف" کا انکشاف ہوتا ہے! یہ زمانہ بڑا عجیب قسم کا ہے رات کو تو اکثر خشک و تر خواب آتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن دن کو بھی لوگوں میں "محو خواب رہنے کا مرض ان میں بڑھتا جا رہا ہے" اس پرواز تخیل کا دوسرا نام "اعلیٰ مقصدیت" ہے یعنی کوئی بلند مقصد پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ واقعی یہ بڑی اچھی چیز ہے نفسیات والوں نے تو اس موضوع پر کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں پر ہمارے قریشی صاحب کی نظر پڑ گئی ہے! چنانچہ انہوں نے اپنے لئے "ڈاکٹری" کا پیشہ تجویز کیا ہے۔ قریشی صاحب بالکل ایسے ہی جیسے کوئی ڈاکٹر کسی مریض کیلئے مارفیا کا ٹیکہ تجویز کرتا ہے بڑے دھڑلے سے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر بن کر قوم کی "خدمت" کریں گے! ان کا فلسفۂ خدمت بھی یقین جانئے بڑا عجیب و غریب ہے کہتے ہیں کہ آپ "رائج الوقت" ڈاکٹروں کی خصوصیات کی پیروی نہیں کریں گے اور یہ کہ ان کا سلوک دیکھ کر لوگ ان ڈاکٹروں کو بھول جائیں گے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر آپ نے ابھی سے اس کی پریکٹس شروع کر دی ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" قرائن سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عام ڈاکٹر تو صرف ہڈی جوڑتے ہیں یہ حضرت ہڈیاں بھی چاٹ جائیں گے ان کے نزدیک ڈاکٹری محبت

بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان پر "فضلِ ربی" کا نزول ہوتا ہے!! یہ تو سب کو علم ہے کہ قوم میں بیماری اور موت کی شرح بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے لیکن قریشی صاحب چونکہ بنی نوعِ انسان کے بڑے ہمدرد ہیں اس لئے ان کی دیرینہ آرزو یہی ہے کہ لوگ نہ مریں بلکہ صرف بیمار ہی رہیں! اور موت کی شرح بھی بیماری کی شرح میں "جمع" ہو جائے!! اسی فکر اور غم و حزن میں وہ دن بدن موٹے ہو رہے ہیں! وہ گھبرا رہے ہیں کہ اگر طالب علمی کے زمانے میں ہی موٹے ہو کر ڈرم کی طرح گول ہو گئے ---- اور ڈاکٹر بننے کے بعد موٹاپے کے امکانات غیر روشن ہو گئے تو آمدنی کو کس بھاڑ میں جھونک سکیں گے؟ یہ غم حضرت کو کھائے جا رہا ہے۔ اگر کوئی صاحب ایک آدھ تیر بہدف نسخہ تجویز فرمائیں تو کرم بالائے کرم ہوگا!۔

قریشی صاحب کے کئی شغلے ہیں۔ آپ اس ڈاکٹری اصول پر بصدقِ دل ایمان رکھتے ہیں صحت قائم رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور ہونا چاہیئے ---- یوں تو اُن کے کئی مشاغل ہیں ---- لیکن سب سے بڑا مشغلہ "حلقہ دوستاں" کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہے! اس ذوق کو پورا کرنے کے لئے اپنے اوقات کو نہایت فراخدلی سے قربان کرتے ہیں!! پھر "قلمی دوستی" کے بھی بڑے مداح ہیں لیکن وہ قلمی دوستی خاص احباب ہی سے کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک خاص دوستوں کے علاوہ باقی مخلوق کی حیثیت HEREMY BENTHAM کے بقول موسمِ گرما کی مکھیوں سے چنداں زیادہ نہیں۔

قریشی صاحب صرف اپنے "پیشے" ہی میں ماہر نہیں بلکہ ہر فن مولا ہیں! مطلب یہ ہے کہ ہر پھڈے میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ اور جب ٹانگ اٹھ جاتی ہے تو پھر دولتے جھاڑتے ہوئے راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً آج کل کرکٹ کا ہر جگہ چرچا ہے بلکہ میرا خیال تو یہی ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اذان کے بعد غالباً اس کے کان میں کرکٹ کی "کومنٹری" ہی داخل کی جاتی ہے!! بچے، بوڑھے، نوجوان سب کے اعصاب پر کرکٹ کا بھوت سوار ہے!! معلوم ہوتا ہے کہ قریشی صاحب کے کان میں اذان دینا تو بھول گئے تھے صرف کومنٹری کو داخل کیا ہوگا ہے!! اب بھلا قریشی صاحب کیسے دلچسپی نہ لیں؟ دلچسپی کا ذکر ہی کیا، ہمالے سے یہ حضرت تو اپنے آپ کو کرکٹ کا باوا سمجھتے ہیں۔ لاہور میں پاکستانی ٹیم کی "شہادت" کی وجوہات اس طرح لہک لہک کر بیان کرتے ہیں جس طرح کوئی تاریخ دان خاندانِ مغلیہ کے زوال کے اسباب بیان کر رہا ہو!! لیکن کرکٹ کی مذمت کرنے والوں کے مجمعے میں یہی قریشی صاحب کروٹ بدلیں گے اور یوں گویا ہوں گے ---- "صاحب کرکٹ بھی کوئی گیم ہے، تین تین چار چار دن تک کوئی مُردہ بھی تختہ دار پہ لٹکنا پسند نہیں کرتا! اتنا طویل انتظار کرکٹ کی گیم کے لئے کرنا تو پرلے درجے کی حماقت ہے! کھلاڑیوں کی نہ صرف پینٹیں پھٹ جاتی ہیں بلکہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی تھک جاتی ہیں (اور بیماری کا نام لیتے ہی قریشی صاحب کا چہرہ ایک دفعہ پھر کسی امید سے سُرخ ہو جاتا ہے) ایسی فضول گیم کا فائدہ ---- جس میں تفریح کی بجائے کوفت ہو؟ بہرحال بڑے "گپ نواز" ہیں! احباب کے ہجوم میں خوب بیٹھ جاتے ہیں کسی مسئلہ پر بحث بھی خوب کرتے ہیں لیکن جب ناکامی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں تو فوراً بیٹھ جاتے ہیں۔ ورنہ وہاں سے اس طرح بھاگتے ہیں ---- جس طرح کابل قندھار کا پٹھان جون جولائی میں لاہور سے بھاگتا ہے!

یہ قریشی صاحب کچھ نوکیلے ٹائپ آدمی ہیں یعنی ہر وقت چُھری کی مونچھوں کی طرح "اکڑے" رہتے ہیں۔ حق بات تو یہ ہے کہ اُن کا سایہ اُن سے لمبا دکھائی دیتا ہے ---- کسی بزرگ کا قول سچا ہی ہے۔ "بانکی لکڑی کا بانکا سایہ"!!

قریشی صاحب کی طبیعت میں تلون کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ خیر سے آپ کا سینہ "عقابی روح" سے بھی لبریز ہے ---- وہی عقابی روح جس کے متعلق کسی نے کہا ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
تو ہڑتالیں کرا دیتی ہے سارے کارخانوں میں

کہا جاتا ہے کہ لاہور میں بوٹا سنگھ کی نعش کو میانی صاحب تک لے جانے والوں میں یہ حضرت بھی شامل تھے۔ بلکہ میرا خیال ہے انہوں نے "جنازے" کو کافی دور تک کندھا بھی دیا ہوگا۔ مگر جب حالات نے کروٹ بدلی تو یہی صاحب قبر کا نام و نشان مٹانے میں بھی پیش پیش

تھے۔ ایسے لوگ یقیناً ایک نہ ایک دن لیڈر بن جاتے ہیں —— بہرحال قریشی صاحب سے ضرور رسم و راہ پیدا کیجئے —— شاید ان کی ڈاکٹری اور لیڈری سے آپ کو بھی کوئی فائدہ پہنچ جائے —— ایسے آدمی بڑی مدت کے بعد زمین سے "اُگتے" ہیں۔ اگر مستقبل قریب میں عجیب و غریب "انسانوں" کا "ذخیرہ" کرنے کے لئے کوئی میوزیم یا عجائب گھر بنایا جائے —— تو میرا خیال ہے کہ جناب قریشی صاحب سے ہی اس کا "افتتاح" ہونا چاہیئے!! ؎

کب ایسے لوگ ہوتے ہیں پیدا جہاں میں
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اقبال کی شاعری میں مناظرِ فطرت

(بقیہ صفحہ ۲۴)

اقبال کا کلام اسی خواب کی قلمی تعبیر ہے۔ اور عملی تعبیر قوم پر منحصر ہے۔ بہرکیف موضوع وسیع ہے اور یہ اوراق قرطاس محدود! ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے عقل کے فلسفہ سے فطرت کی منظر کشی کا گہرا رابطہ قائم کر دیا ہے۔ یہ ایک خوشگوار جدت ہے جس کے لئے اُردو ادب اور قوم دونوں ہی اقبال کے ممنون رہیں گے۔

مقررین کی قسمیں

(بقیہ صفحہ ۳)

مقرروں کی قسمیں بیان ہو چکی ہیں۔ میری روح پُرفتوح کو تسکین اُس وقت ہوگی جب میری یہ حقیر محنت ٹھکانے لگے گی۔ وہ میری یہ حقیر محنت صرف اُسی وقت ٹھکانے لگے گی جب آپ ہر مقرر کو تقریر کرنے سے پہلے ہی بتا دیں کہ یا حضرت! آپ فلاں قسم سے تعلق رکھتے ہیں!! —— طوطے، لطیفے، یا پوڈری؟

محمد نعیم نیّر

رنگریزے

شہری: کل ایک استاد نے جانوروں کی بولیوں کی ہوبہو نقل اُتاری۔ اور جب وہ گدھے کی نقل اُتار رہے تھے۔ لوگوں نے ان پر نوٹ برسائے۔

دیہاتی: (فکر مند ہو کر) چودھویں صدی ہے بھائی! اب تو ہر بات عجیب ہوتی ہے۔ لوگ اصل کے مقابلے میں نقل کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

عورت: (فون پر) ڈاکٹر صاحب! میرا بچہ ہولڈر کی نب نگل گیا ہے فوراً آیئے!

ڈاکٹر: (فون پر) میں دو مریض دیکھ کر آتا ہوں۔ فکر نہ کیجئے۔

عورت: (گھبراہٹ میں) مگر میں اس وقت تک کیا کروں؟

ڈاکٹر: جو لکھنا ہے پنسل سے لکھیے۔

"آج کل زندگی کی قدر بدل گئی ہے اور لوگ سانپ کے زہر کی بجائے اس کے حسن پر زور دینے لگے ہیں۔"

(عطاء اللہ سجاد)

"ہر بچہ اپنے ساتھ یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا۔"

(ٹیگور)

کہانی

اختر وہاب
(آرٹس)

کناروں کے ساتھ ساتھ

کیپٹن لئیق باجرے کے کھیت کی مینڈھ کی اوٹ میں بیٹھا اپنے ساتھیوں کے ساتھ "ریوالور گیٹ" وگٹ کی سیدھ میں نظریں جمائے سکھوں اور ہندوؤں کی حملہ آور ٹولیوں کو منتشر کرنے کی فکر میں تھا۔ ہر طرف سے تاڑ تاڑ کی گونج اور دستی بموں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے —— تھری ناٹ تھری کی گولیاں ان کے بالوں کو سہلاتی گذر رہی تھیں —— ٹامی گنوں کی رٹ..... ٹیٹ سے کان پھٹے جا رہے تھے —— نیزوں اور گنڈاسوں کے شور میں بھی اپنی بیوی اور بچے کا تصور جھول رہا تھا —— طلعت کا مسکراتا چہرہ اور شاکو کے ہنستے ہونٹ اس کے ذہن سے ہٹ چکے تھے —— اور وہ آہنی انسان حملہ آور ٹولیوں پہ جھپٹ پہ جھپٹ خالی کرتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی مشکل سے سکھوں کی یلغار کو روکے ہوئے تھے ——

لئیق کی نظروں کے آگے کئی سکھ زخمی اور مرے پڑے تھے —— اللہ مہاراج اور رحما نصیوں کے منہ سے رام نام اور ست سری اکال کی بجائے گالیوں کا طوفان اُمڈ رہا تھا —— مینڈھ کا مورچہ باندھے بچپن مسلمانوں کی یہ ٹولی نہایت بے جگری سے لڑ رہی تھی۔ ملکی تقسیم کے سوال نے صورتحال کو ایک خون آشام جنگ کی شکل دے دیا۔ ہندو مسلم ایک دوسرے کی جان کے لاگو ہو گئے —— انسان، انسان کے خون سے پیاس بجھانے لگا —— خوبرو اور جوان سال مرد جنگ و جدل کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے —— لاکھوں بیوہ ہو گئیں —— عورت کی عصمت و عفت کا تاج بھیڑیوں اور درندوں کے پنجوں میں الجھ کر رہ گیا ——

آج گاؤں کے رئیس شوکت جمال کا بیٹا لئیق جمال اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے گاؤں کی بیٹیوں کی عزت کی حفاظت کے لئے لڑ رہا تھا —— درندوں کی اس یلغار کے آگے اپنے مستحکم عزائم کی خندقیں تعمیر کر رہا تھا —— جس کی انگلیوں کو اب ٹریگر پہ تھم کر رکنا نہیں آ رہا تھا ——

گاؤں کا ہر جوان لئیق کی جواں مردی —— قوت ارادی اور جرأت سے متاثر تھا —— دشمن کے مقابل وہ لوگ سر بکف ہو کر میدان کارزار میں آ بیٹھے تھے —— یہ منظم گاؤں کی مٹی اور ریت کے ٹیلوں کے محور سینے ان کی جواں مردی و جواں ہمتی کے آئینہ دار تھے —— ہر فرد کے ذہنی سمندر میں لئیق کی تقریر کی لہریں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں ——

"ملت کے سپوتو! آج ہمارا سفینۂ حیات —— اگر ایک پُرسکون سطح پہ چلتے چلتے حالات کے بھنور میں آ پھنسا ہے —— ان گرداب کی مرتعش لہریں دھیرے دھیرے اس پہ غلبہ ڈالتی چلی جا رہی ہیں —— عرصۂ حیات ہم پر تنگ ہو چکا ہے —— ہماری بہنوں اور بیویوں کی عصمتیں ہمارے حوصلوں پہ آس لگائے بیٹھی ہیں۔ —— ہمارے بچوں اور بزرگوں کی زندگیاں ہمیں سسکتی ہوئی پُر امید نظروں سے دیکھ رہی ہیں —— دشمن کا زہر آشام پنجہ ہماری گردنوں تک پہنچ چکا ہے —— یہ وقت ہے رقیب کے ہاتھ سے ہی نیزہ چھین کر اس کی پسلیاں توڑ دو —— صفحۂ کائنات پر ایک عظیم کارنامہ ثبت کر دو۔ اس سیلاب کی سرکش موجوں کے آگے اپنی لاشوں کے بند باندھ دو —— تاریخ عالم ایک اور خون آشام ساکھ پر تھرا اٹھے —— اور

تمہاری آنے والی نسلیں تم پر فخر کر سکیں۔۔۔ ہوشیار۔۔۔ دشمن کے بھیجے اسلحہ و بارود سے پاش پاش کر دو۔۔۔۔"

اور پھر سچ مچ جیسے ہاتھوں میں رعد کی سی کڑک آ گئی —— دشمنوں کے سر کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ مرنے والوں کی دلخراش چیخیں بارود کے بھیانک شور میں مدغم ہو کر رہ گئیں —— لیکن دوسرے لمحے خفیہ سمت سے "ست سری اکال" کے نعرے بلند ہوئے اور حویلی کے محافظ دستے کی بندوقیں شعلے اگلنے لگیں —— لئیق اب پچھلی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔ باجرے کے کھیت میں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا وہ حویلی کے صدر دروازے کی طرف سرک آیا —— سکھ محافظ اپنے ہاتھوں میں بندوقیں، پستول، کرپانیں اور برچھے تانے حویلی کے صدر دروازے پر حملہ آور ہو رہے تھے —— دیکھتے ہی دیکھتے قد آدم دروازہ ٹوٹ کر زمین بوس ہو گیا —— سکھ دستہ اندر گھستا چلا گیا۔ اندر سے فائروں کی بوچھاڑ نے ان کے قدموں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ مگر یہ بوچھاڑ عارضی تھی ——

لئیق پوری قوت سے لڑ رہا تھا۔ اُسے اب اپنی جان کی حفاظت مقصود نہ تھی۔ وہ بغیر کوئی آڑ لئے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ اس کا ریوالور رام سنگھ، اودھے سنگھ، سندر پال، جیسرام، بلونت سنگھ، ابیت سنگھ اور موہن لال کی کھوپڑیوں میں سوراخ کرتا ہوا اب بھرت سنگھ کی شہ رگ کو "کور" کر رہا تھا ——

دفعتاً دھواں سا اٹھتا دکھائی دیا —— آگ کے لپکتے شعلوں نے حویلی کی عمارت کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ دہکتے بلکتے بچوں کو غمزدہ مائیں اپنی گودوں میں اٹھائے باہر کود پڑیں۔ پٹرول اور مٹی کا تیل چھڑکی دیواروں پر کھولتے تیلوں کی طرح ابل رہا تھا —— سکھ عورتوں پر پاگل پن سوار تھا۔ معصوم بچوں کو نیزوں اور برچھیوں پر اچھالا جانے لگا —— معصوم بچے۔۔۔۔ ننھی منی صورتیں۔۔۔ کپکپاتے ہونٹ۔۔۔ جھپکتی آنکھیں۔۔۔ لام۔۔۔ جنگ و جدل۔۔۔ مشین گنوں کی تڑ تڑ۔۔۔ پیچھے ہوں اور نادر بڑی بجھتی شکستہ آہیں۔۔۔ انگشت بدنداں عصمتیں۔۔۔ خون میں لتھڑی لاشیں، عالم میں لوٹتے زخمی اجسام، ہند و پاکستان کی تقسیم کا سوال مختلف جانوں میں الجھ کر رہ گیا —— دم توڑتی زندگیوں میں سمٹ گیا —— پاکستان اور ہندوستان کا قیام اور سرحد پر بہتا انسانی خون کا دریا ——

اٹھیں گئیں اب بھی چیخ رہی تھیں ——

دستی بم اچھل اچھل کر اودھم مچا رہے تھے۔ لئیق کی آنکھیں سرخ تھیں۔ غصے کا بحر بیکراں اس کی آنکھوں میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر قہر و غضب کی لکیریں گہری ہوتی گئیں —— اور پھر اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے کے ساتھ مومن لپک پڑے —— مرد، عورتیں، اب بچے ہو کر خون کی ہولی کھیل رہے تھے۔ دیکھتے دیکھتے حویلی کا صحن لاشوں سے بھر گیا —— گلی سڑی لاشیں —— سسکتے دم توڑتے زخمی —— اب سکھ اور ہندو میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور مسلمانوں کی متلاشی نظریں ماؤں اور بہنوں کو تلاش کرنے لگیں۔ لئیق اپنی بیوی طلعت کو آوازیں دے رہا تھا لیکن طلعت کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ نہ ہی اُسے اپنا بیٹا ٹاکو دکھائی دیا۔ وہ بے چینی میں ہیولوں اور ناموروں کے جھرمٹ سے نکل آیا۔ سعید، نجمی، بختیار اور فواد بھی اپنی عورتوں کی تلاش میں سرگرداں تھے ——

اچانک رحمت بابا نے آکر لئیق کا کندھا تھام لیا اور اسے جھنجوڑتے ہوئے چلا اٹھا —— "لئیق بیٹے بھاگ دوڑو —— جلدی کرو، طلعت اور دوسری عورتوں کو صبح ان کے بچوں کے ساتھ سکھوں کی ایک ٹولی حویلی کے دروازے سے لے کر فرار ہو گئی ہے —— بھاگو —— دوڑو ——"

اور پھر جیسے طوفان نے پیچھے کروٹ لی ہو —— لئیق اور اس کے کئی جانباز ساتھی سکھوں کے ٹھکانوں کی طرف اڑے جا رہے تھے —— اندھیری رات کی پراسرار تاریکی نے سارے گاؤں کو اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا —— سیاہ رات کی تاریکیاں اور بھیانک تر لگیں شانہ بشانہ کائنات پر سونے لگیں —— لئیق اس تاریکی میں دشمنوں کا سینہ چیرتے ہوئے خم کے گردوارے کی طرف اڑا جا رہا تھا —— !

~~~~~~~~

ایک دھرم شالے کے تنگ برآمدے میں خالصہ پارٹی ڈیرے جمائے ہوئے تھی —— اغوا شدہ مسلمان عورتیں برآمدے کے ستونوں سے بندھی تخت پوش پر بیٹھے اپنے بچوں کو لرزتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں —— طلعت کا چہرہ ٹاکو کو دوسرے بچوں کے ساتھ سکھوں کی تلواروں کے سامنے بیٹھے دیکھ کر پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کے آنسو ایک خاموش ندی کی طرح بہہ رہے تھے —— بھرت سنگھ ایک ہاتھ میں پیالہ لئے اور دوسرے ہاتھ
~~~~~~~~

صراحی تھامے نمودار ہوا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں ہیجانی لہریں اُمڈ آئی تھیں ـــــ وہ شراب سے لبریز پیالہ لیا طلعت کے سامنے آ کھڑا ہوا ـــــ

"غیور مسلم سعد اللہ خاں کی بیٹی اور شہیدِ نگر کے رئیس کی حسین جمیل بیوی ـــــ! آج تیرا جسم، تیرے ہونٹ، تیرے عارض گنگنوں کی جھلملاہٹ ــ جھنجھر میرے لئے ہوں گی ـــــ تیرے شوہر کی زندگی کا آفتاب لبِ بام ہے۔ کل اس کی لاش اس دھرم شالے کے دریچوں میں لٹکائی جائے گی ـــــ ابھی تیرے سامنے تیرے بچے کو نیزے کی نوک پر اچھالا جائیگا ـــــ اور ـــــ"

طلعت کے حلق سے ایک طویل چیخ نکلی "نہیں ـــــ نہیں ـــــ تم ایسا نہیں کر سکتے" وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے متواتر چیخے جا رہی تھی ـــــ مگر بھرن سنگھ کے قہقہے میں طلعت کی سسکیاں دب کر رہ گئیں وہ شراب کا پیالہ طلعت کے ہونٹوں کی طرف بڑھاتا ہوا بولا ـــــ

"پیاری ـــــ تم جو ہوگی وہی ہوگا ـــــ تم سکھ رسالے کے سردار بھرن سنگھ کی دھرم پتنی ہو گی ـــــ تمہیں امرت کے گھونٹ چکھنے ہوں گے ـــــ دیکھو تو ـــــ کتنی لذت اور شیرینی ہے اس میں ـــــ امرت جو ہوا امرت ـــــ آبِ حیات ـــــ ہا ہا ـــــ ہا ہا ہا !!!

اور پھر طلعت کے ہاتھ کی ٹھوکر سے پیالہ اچھل کر سردار کے منہ پر جا پڑا ـــــ فضا میں کانچ کی چوڑیوں کی جھنجھلاہٹ گونج کر رہ گئی بھرن سنگھ کی داڑھی دیسی شراب کے بلبلوں میں تر ہو گئی ـــــ بڑھ مٹیلی لیمپ کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بڑا بھیانک لگ رہا تھا ـــــ

"اس کے بیٹے کو لاؤ ـــــ" ننھا ٹاکو کو لا کر آگے کھڑا کر دیا گیا ـــــ

بھرن سنگھ کی آنکھوں سے شعلے ابھر رہے تھے ـــــ دوسرے لمحے ٹاکو کا نازک جسم فضا میں بلند ہوا اور بھرن سنگھ کا نیزہ اس کے ننھے سے پیٹ کو چیرتا ہوا کمر کے پیچھے جا نکلا ـــــ طلعت چیخ مار کر بیہوش ہو گئی ـــــ بچہ نیزے کی نوک پر تڑپ تڑپ کر اپنے باپ کو پکار رہا تھا ـــــ "ڈیڈی ـــــ ڈیڈی ـــــ مجھے دشمنوں سے بچاؤ ـــــ (مجھے ظالموں سے بچاؤ) ـــــ" بھرن سنگھ جیسے کھینچ کھینچ قہقہے لگائے جا رہا تھا ـــــ دوسری مسلمان عورتیں اور بچے دم سادھے کھڑے تھے ـــــ ٹاکو سسک سسک کر ٹھنڈا ہو گیا اور پھر اس کا جسم فرش پر پڑا تھا ـــــ

پینے بعد دیگرے شراب کے کئی جام بھرن سنگھ کے حلق سے اتر رہے تھے ـــــ رات اور تاریک ہو چکی تھی ـــــ

بھرن سنگھ نے پانی منگوا کر طلعت کے چہرے پر چھڑکا ـــــ وہ ہوش میں آ کر چلانے لگی ـــ "ظالم ـــــ پاپی ـــــ خدا دیکھ رہا ہے ـــــ وہ تم سے پوچھے گا ـــــ تم میرے بھائی کی دوستی کا دم بھرتے تھے ـــــ مجھے اپنی بہن کہتے تھے" مگر بھرن سنگھ کے لمبے اور کھردرے ہاتھ طلعت کے گلو کی طرف بڑھنے لگے ـــــ اس نے اس کا لباس نوچ کر پھینک دیا ـــــ چاقو سے دھجیاں کاٹ دیں ـــــ اور اسے اپنے جسم سے چمٹانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کئی فائر ہوئے ـــــ بھرن سنگھ تڑپ کر زمین پر گر پڑا ـــــ ایک گولی طلعت کا سینہ بھی چیر گئی ـــــ غلطی ہوئی

لئیق آ گیا تھا اپنے ساتھیوں کی جمعیت میں ـــــ سکھ ایک ایک کر کے مرتے گئے ـــــ سکھ عورتوں اور بچوں کو لا کر ایک قطار میں کھڑا کر دیا گیا ـــــ لئیق کی پھٹی پھٹی نظریں طلعت اور ٹاکو کی لاش پر جم گئیں ـــــ اس کا ذہن دھندلا گیا ـــــ اور اس نے لاشوں پر چادر ڈال دی ـــــ سکھ عورتیں اور بچے لئیق کو اپنی طرف آتا دیکھ کر سہم گئے ـــــ

اس نے ایک سکھ بچے کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور بڑبڑانے لگا ـــــ "جس کھیت میں تمہارے اسلاف نے کانٹے بوئے ہیں وہ تمہارے لئے پھول نہیں پیدا کر یگا ـــــ" اور پھر وہ بچے کو فضا میں اچھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک سکھ عورت نے آ کر اس کے پاؤں تھام لئے ـــــ

"سردار ایسا نہ کرو ـــــ تمہاری قوم تو اتنی سنگدل نہیں ہوتی ـــــ"

اور لئیق کے ہاتھ رک گئے وہ اس عورت کی طرف دیکھ رہا تھا اس کا ذہن اس سے آشنا تھا ـــــ یہ کوشنا تھی ـــــ کرشنا ـــــ!!

~~~~~~

اس کے تصور نے ایک بھی چھلانگ لگائی ذہنی چلمن کے پیچھے جھانکتی ہوئی یادوں میں الجھ گیا۔ اسے دہلی کی وہ شام یاد آ گئی ـــــ نکھری اور دھلی دھلی شام ـــــ پارک کی ایک بنچ پر بیٹھا وہ افقِ مغرب پر پام اور یوکلپٹس کے پودوں کے پیچھے سورج کو جھکتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے پیچھے ہر طرف خاموشی اور ویرانی طاری تھی۔ سیمنٹ کے فوارے سے چھوٹتی پانی کی بوندیں ہنستو اور چمپا کی ان کلیوں کو گدگدا رہے
~~~~~~

کی شکل میں تھیں جو شاید کافی دیر سے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں ——
انہیں جھنڈوں کے پیچھے اس نے ایک چیخ ابھرتی —— پتوں کی دیوار کے
ساتھ وہ دوڑتا چلا گیا۔ ایک آوارہ شخص ایک عورت کو چھیڑ رہا تھا جو
بے سکون چیختی جا رہی تھی —— وہ عورت تھی کرشنا —— اور مرد بھرن سنگھ
——

لئیق نے بڑھ کر بھرن سنگھ کے جبڑوں پر ایک گھونسہ رسید
کر دیا۔ ازلی بزدل بھرن سنگھ ایک ہی ضرب سے بھاگ نکلا۔ کرشنا
لئیق کو تشکر اور شرم کے ملے جلے جذبات سے دیکھ رہی تھی۔
کرشنا نے دہلی میں اسی کے ساتھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ کرشنا
اسے بھائی کہہ کر پکارتی تھی۔ ان دونوں کے گاؤں بھی قریب قریب تھے
اب فوج میں کمیشن لینے کے بعد لئیق کی شادی ہو گئی اور اسے کرشنا
سے ملے مدتیں گزر گئیں ——

~~~~~~

کرشنا کو دیکھ کر لئیق نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے ہونٹ
ہلے۔ "جاؤ تم سب آزاد ہو ——"
سب چلے گئے۔ مگر کرشنا کھڑی رہی۔ اس نے آہستہ سے کہا
—— "سردار میں تمہارے ساتھ جاؤں گی"۔
"کہاں؟" لئیق حیران تھا۔
"پاکستان"
گنگا جمنا کی لہروں کو خیر آباد کہتے ہوئے وہ چل دیئے۔
لئیق کا باپ شوکت بھی آنکلا اور کرشنا کو قافلے میں دیکھ کر سلگ
اٹھا —— "لئیق یہ کیا بات ہے —— کرشنا یہاں کیسے —— ؟"
لئیق پرسکون آواز میں بولا "اسے میں نے پناہ دی ہے۔ یہ
ہمارے ساتھ جائے گی ——"
"مگر وہ ایک سانپوں کے کنبے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ ایک
زہریلی ناگن ہے"۔
"مگر ابا —— میں اسے بہن بنا چکا ہوں"۔
"بہن —!" شوکت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ کرشنا
انہیں حیرت سے گھور رہی تھی۔ اس کے ذہن پر بہن کا لفظ ہتھوڑا

بن کر ضربیں لگا رہا تھا ——
قافلہ چل گیا۔
پورب دیس دلی کی عمارتیں پیچھے سمٹتی گئیں —— ہوشیار پور
کے قریب آگیا اور دشمن ٹولی نے ان پر حملہ کر دیا۔ بیاس کنارے وہ
جم گئے —— لئیق اب پھر ایک مجاہد کی طرح لڑ رہا تھا۔ اس کے کندھوں
سے تھری ناٹ تھری کی رائفل شعلے اگل رہی تھی —— سکھوں کی
لاشیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں ——
اچانک لئیق کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی خنجر اس کی پسلیاں
توڑتی ہوئی نکل گئی ہو۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر منہ کے بل گر پڑا ——
مڑ کر دیکھا تو اس کی نظریں پتھرا گئیں —— کرشنا ریوالور لئے کھڑی
تھی۔
"ناگن —!" لئیق کے ہونٹ ہلے مگر اس کی نحیف آواز کرشنا
کے قہقہے میں دب گئی۔
"احمق انسان —— تم نے میرے رشتہ داروں کو قتل کیا
بھرن سنگھ میرا شوہر تھا —— میں ارجن سنگھ کی بیٹی اور جیون سنگھ
کی بہن ہوں —— تمہیں بھائی بنا کر میں نے دھوکہ دیا —— ہا ہا
—— ہا ہا —— خاندان کی جے —— !"
مگر عین وقت پہ ایک اور مسلمانوں کا بچھڑا ہوا لشکر آن نکلا
—— سخت لڑائی ہوئی —— کرشنا پر ہسٹریائی کیفیت طاری تھی
اور لئیق موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔
"یہ قوم کتنی سنگدل ہوتی ہے —— مکار —— فریبی"
اور وہ منہ پھیر کر کراہنے لگا ——
مگر یکلخت ایک ہچکی میں یہ کراہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ڈوب
گئی ——
سکھ دستہ بھاگ گیا —— طوفان چھٹ چکا تھا ——
کارواں کے باقی لوگ کشتیوں میں سوار بیاس کی لہروں کو دیکھ رہے
تھے جو کناروں کے ساتھ ساتھ علینی شہید وطن کی نوحہ خوانی کر رہی
تھیں —— پاکستان میں وہ لوگ پہنچ گئے تھے ——
آج مدتوں بعد برگد کے بوڑھے درخت کی چھاؤں میں
~~~~~~

نجمی بیٹھا اپنے نئے ہمجولیوں کو ایک کہانی سنا رہا تھا ——— لئیق اور اس کے کاروان کی داستانِ اندوہ ناک ——— !

کس طرح وہ سب ہنستے کھیلتے، زندگی کے ہموار ناہموار میدانوں میں سنگلاخ چٹانوں سے گاہ بگاہے ٹکراتے چلے جا رہے تھے ——— زیست کے صحراؤں کی خاک چھانتے ہوئے ایک ریتیلے طوفان سے پالا پڑا۔

گرد کے بادل چھٹے۔

غبار کی آندھیاں آٹھیں۔

اور انہیں بادلوں اور آندھیوں کے درمیان ایک سسکتی زندگی نے توڑ دیا۔

سازِ ہستی کے تار جھنجھنا اٹھے۔

نغمات کا دل ٹوٹ گیا۔

ریت اور مٹی کی شفافہ زمین میں ایک شگن پڑ گئی ——— دم توڑتی آرزوئیں اور ارمان اس دراڑ میں سما گئے۔ وقت کے جھکڑوں نے اس جگہ ایک ٹیلہ بنا دیا۔ چکنی ریت پہ قافلے والے اپنی محبت کے نقوش چھوڑ کر چلے گئے ——— یہ نشان اب بھی موجود ہیں اور وہ ٹیلہ اب ایک قبر کی صورت اختیار کر چکا ہوگا ——— !

نجمی اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ بوڑھا برگد بھی تقدیر کی اس ستم ظریفی پہ رو دیا ——— فضا کی پلکیں بوجھل تھیں ——— طوفان اب ختم ہو چکا تھا ——— بیاس کے انہیں کناروں کے ساتھ ساتھ ——— !!

"میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوۂ حسنہ پہ چلنے میں ہے۔ جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمارے لئے بنایا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پہ رکھیں۔"

حضرت قائد اعظم مرحوم

"انتقاد"

بقیہ صفحہ ۴۴

توریت۔ انجیل اور دیگر آسمانی صحیفوں کے متعلق گرانقدر تحقیقات کی وجہ سے علمی حلقوں میں مقبول ہیں۔ زیرِ نظر کتابچہ بھی دراصل آپ کی ایک نادر تحقیق کا نتیجہ ہے "انجیل مرقس کا آخری ورق" کے عنوان سے آپ نے ایک تحقیقی مقالہ ——— مشنری کالج ربوہ (جامعہ احمدیہ) کی انجمن العلمیہ میں پڑھا۔ اس مجلس نے افادۂ عام کے لئے اس گرانقدر مقالے کو کتابی صورت میں شائع کیا ہے اس تحقیقی مقالے میں یہ ثابت کیا گیا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت کے متعلق' جو نظریہ' جماعت احمدیہ کے بانی حضرت مرزا غلام احمدؑ صاحب قادیانی علیہ السلام نے آج سے ستر سال قبل پیش کیا تھا۔ وہی درست ہے !

مقالے میں اناجیل کے قدیم ترین نسخوں کے حوالے بکثرت دیئے گئے ہیں۔ یورپین مؤرخین کی تحقیق و تدقیق پہ بھی سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ مستند اناجیل اربعہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پہ تشریف لے جانے کا واقعہ کہیں درج نہیں۔ البتہ بعد میں جو اضافے کئے گئے ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام آسمان پہ بجسم عنصری' اللہ تعالیٰ کے ساتھ عرش پہ آرام فرما ہیں "ریوائزڈ ورشن" کے مختلف ایڈیشنوں کے حوالوں سے اصل حقیقت ظاہر کی گئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ یہ ساری آیات بعد میں کتاب مقدس میں داخل کی گئی ہیں۔

زیرِ نظر مقالہ انجیل کے اس نسخے کے گرد گھومتا ہے جو مشہور و معروف بائیبل سکالر' سی۔ آر۔ گریگری کو کوہ ایتھاس سے ملا ہے فاضل مقالہ نگار نے مقالے کی بنیاد یہ خاص نسخہ کو دیا اور عرق ریزی کی ہے۔

عالم عیسائیت کے نامور علما و فضلا کی بے شمار کتب سے حوالے جا بجا دیئے گئے ہیں انداز بیان دلچسپ اور دلائل ٹھوس ہیں۔ اس موضوع پہ جماعت احمدیہ کی طرف سے جو لٹریچر پیدا کیا گیا ہے اس مختصر مگر جامع کتابچے سے اس میں گرانقدر اضافہ ہوا ہے۔ (ل۔م)

چنہاں دیاں چھلاں

(پنجابی)

منظور احمد شاکر
بی-اے (اولڈ بوائے)

غزل

"کی ہو گیا کملیاں اکھیاں نوں اینویں چھم چھم بارش لائی ہوئی نے
کِسے بے پرواہ دیاں نیناں نے کوئی وڈی مصیبت پائی ہوئی نے"

گزران میری دی پچھنائیں بیبی اوکھی سوکھی نبھدی اے
ماہی ساڈا دیس اُجاڑ گیا خبرے کیہڑی جھوک وسائی ہوئی نے

کِتے زُلفاں جال وچھائے ہوئے نے کِتے پلکاں تیر چڑھائے ہوئے نے
اینہاں ظالماں پنچھی پکڑن لئی تھاں تھاں تے پھاہی لائی ہوئی نے

کی مَت دیواں اکھیں جھلیاں نوں نہیں آوندا صبر اکلیاں نوں
اینہاں چوری چوری رووَن دی دینہ راتیں عادت پائی ہوئی نے

بھاویں بخشے تے بھاویں نہ بخشے اس گل دی نہیں پرواہ شاکر
اینہاں عاشقاں ربدیاں ماریاں نے پیاد دی غلامی چائی ہوئی نے

لطف الرحمٰن محمود
بی-ایس سی (فائنل)

غزل

ڈھیندے او کیوں سانوں ہس ہس کے
چڑکے لاندے او ڈس ڈس کے

اوہ یار میرا دل لے نسیا!
اوہنوں لبھدا پھرداں نس نس کے

اُمید دے بوٹے سڑ گئے سارے
مُڑ گئے بدل وس وس کے

کیہڑے بوہے تے متھا رکھیا!
پتھر ہو گیا گھس گھس کے

پیار دے پنچھی نہیں اُڈدے
بنھوں نہ زلفاں کس کس کے

غیراں دا کی شکوہ کریئے
تھک گئے سجن ڈس ڈس کے

محمود نہ اوہ شرما جاون
توں ویکھ زخم نوں ہس ہس کے

منظور احمد شاکر
بی-اے (انڈر گریجوایٹ)

کافی

ہُن موڑ مہاراں سائیاں وے
تیرے ویکھن نوں سدھراں وے

شہر بھنبور ہُن کھاون آوے
پُنّن خان دے باہجھ نہ بھاوے
اکھیں بے درداں سنگ لائیاں وے
ہُن موڑ مہاراں سائیاں وے

سینے اگ فراق دی بلدی
آ وے سجناں جلدی جلدی
تیرے یاداں مار مکائیاں وے
ہُن موڑ مہاراں سائیاں وے

تارے گِندیاں رات دہاندی
لمیاں راتاں نیند نہ آندی
ہُن رو رو اکھیاں آئیاں وے
تیرے ویکھن نوں سدھرائیاں وے

شاکر ہنجو آس تے بہرے لائے
آس دے بال کے دیوے بجھائے
بھج یاداں یار جُدائیاں وے
ہُن موڑ مہاراں سائیاں وے
تیرے ویکھن نوں سدھرایاں وے

تبصرہ

(ادارہ)

انتقاد

"عید کی قربانیاں"

مصنف حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد، ایم اے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶، ضخامت ۳۲ صفحات، طباعت و کتابت عمدہ، کاغذ اچھا۔ سرورق سادہ مگر رنگین۔ قیمت ۳ر ملنے کا پتہ: نظارت اصلاح و ارشاد صدر انجمن احمدیہ ربوہ۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ سال یہ سوال اٹھایا گیا تھا۔ کہ عید الاضحیٰ کے موقعے پر جو قربانیاں دی جاتی ہیں۔ ملک کی موجودہ معاشی کیفیت کے پیش نظر نیز قومی فلاح و بہبود کی خاطر، ان کی روک تھام ہونی چاہیئے اور اس طرح جانوروں کا خون بہانے پر صرف ہونے والی رقم، غرباء و مساکین میں نقدی کی صورت میں تقسیم کرنے کے علاوہ قومی و ملی مفاد پر صرف کی جائے!

بظاہر یہ سوال اتنا "معقول" اور "موثر" تھا کہ متعدد علماء و فضلاء کو بھی ٹھوکر لگی۔ اور انہوں نے اس کی حمایت کی۔ اس طرح ان کی تائید مزید سے یہ مسئلہ اور بھی سنگین صورت اختیار کر گیا۔

موجودہ مادی دَور اپنے لادینی اثرات کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی خطرناک نظر آتا ہے۔ بدقسمتی سے اس صدی میں اسلام کے اندر متعدد ایسے فتنے بھی رونما ہوئے جن کا اولین مقصد یہی تھا کہ اسلامی شریعت کو وقت کے تمام بہاؤ "تقاضوں" اور زمانے کی "قدروں" کے مطابق ڈھالا جائے۔ ان "تقاضوں" اور "قدروں" کی حقیقت کچھ بھی نہیں! معاندۃ المسلمین کے خوف سے چونکہ اعلانیہ تخریب پھیلانے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اس لئے "جدید تقاضے" اور "نئی قدریں" کے حسین و جمیل الفاظ گھڑ لئے گئے۔ یہ تحریک بھی ایک ایسی ہی تحریک ہے جو ہمارے لئے نئی ہونے کے باوجود پرانی ہے۔ اس نے پہلے بھی اسلام میں کئی مرتبہ (سنہ ۱۹۱۳ء .... سنہ ۱۹۵۰ء) سر اٹھایا۔

سنہ ۱۹۵۰ء میں جب یہ تحریک اٹھی تو اس کتابچے کے فاضل مصنف نے اس فتنے کے رد میں متعدد مضامین تحریر کئے۔ اس تحریک کے دوبارہ سر اٹھانے پر اب ان مضامین کو بیش قیمت اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے جہاں تک کتابچے کی فنی حیثیت کا تعلق ہے وہ انتقاد سے بالا ہے۔ فاضل مصنف اپنی متعدد تصانیف کی وجہ سے برصغیر ہند و پاک میں ایک کامیاب مصنف کی حیثیت سے بے مثال شہرت کے حامل ہیں لہٰذا اس لحاظ سے محتاج تعارف نہیں۔

زیر نظر کتابچہ درحقیقت کئی مسائل کے متعدد جزئی سوالات کے جواب پر مشتمل ہے۔

(۱) کیا عید الاضحیٰ کے موقعہ پر قربانی صرف حاجیوں کے لئے مقرر ہے یا کہ اسے طاقت رکھنے والے غیر حاجیوں کے واسطے بھی سُنّت قرار دیا گیا ہے؟

(۲) کیا موجودہ زمانہ کے حالات کے لحاظ سے یہ حق بجانب ہوگا کہ قربانی میں لاتعداد جانوروں کو ذبح کر دینے کی بجائے مستحقین کی نقد امداد کر دی جائے یا اسے کسی خاص قومی مصرف میں لایا جائے؟

(۳) کیا عید الاضحیٰ کی قربانیوں سے ملک کی حیوانی دولت اور دودھ اور گھی کی سپلائی کو بھاری خطرہ لاحق نہیں ہوتا؟

ان سوالات کے جوابات کو عام فہم اور موثر بنانے کے لئے پہلے وضاحت سے "عید الاضحیٰ" کے حکم کا پس منظر بیان کیا گیا ہے قربانیوں کے متعلق شکوک دور کرنے کے لئے یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ غیر حاجیوں کے لئے قربانی مقرر ہی نہیں ہے اور اس حکم کا اطلاق صرف حاجیوں پر ہی ہوتا ہے۔ فاضل مصنف نے مسلم۔ بخاری۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ مسند احمد غرض احادیث کی تمام مستند کتب کی روشنی میں روز روشن کی طرح اس امر کو ثابت کیا ہے کہ حضرت بانی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر حاجیوں

[illegible] بیان فرمایا ہے " قرآن میں قربانیوں کا ذکر " کے [illegible] سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قربانی کے سلسلے میں احادیث [illegible] قرآنی حکم کی تشریح ہیں۔

اس اہم بحث کے بعد فاضل مصنف نے متعدد موضوعات پر [illegible] کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ مثال کے طور پر چند عناوین ملاحظہ ہوں :-

کیا موجودہ زمانے میں قربانی ضروری ہے ؟

کیا قربانیوں کا کوئی بدل بھی اختیار کیا جا سکتا ہے ؟

جانوروں کی قلت کے خطرہ کا سوال ! وغیرہ وغیرہ

قربانی کے جانوروں کے متعلق بعض پابندیاں کے زیر عنوان یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کردہ پابندیوں کو ملحوظ رکھا جائے تو نزاکت اور نفاست پسندی پر مبنی انتخاب [illegible] احادیث نبوی کی روشنی میں ایسے تمام ارشادات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ " قربانیوں کی وجہ سے اسلام پر زندگی کے ضیاع اور گوشت کے اسراف کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ کتابچہ میں اس الزام کی حقیقت [illegible] ہے! اور ثابت کیا گیا ہے کہ معاملہ برعکس ہے اسی سلسلے میں [illegible] ذکر کیا گیا ہے جس طرح اسلام نے گوشت کے ضیاع [illegible] بچایا ہے۔

[illegible] ہے کہ فاضل مصنف نے یہ کتابچہ تصنیف کرکے عالم اسلام [illegible] احسان کیا ہے اس کے مطالعہ سے قربانی کے حکم پر کئے جانے والے [illegible] اعتراضات کا [illegible] جواب مل جاتا ہے۔ کتابچہ سنجیدہ نگاری اور [illegible] ہے اسلام کی واضح تعلیم کے یکساں پہلوؤں [illegible] پر روشنی ڈالتا ہے۔

(ل ، م)

(۳) SPIRITUAL TALKS روحانی باتیں

مصنفہ حضرت [illegible] ابراہیم بقاپوری مترجم [illegible] محترم [illegible] [illegible] صفحات ۴۴ [illegible] [illegible] ملنے کا پتہ [illegible] [illegible] احمدیہ ربوہ۔

اس کتابچہ کے مصنف [illegible]

[illegible] حضرت مولانا [illegible] جماعت احمدیہ [illegible] سے مستفید ہونے کا شرف حاصل ہے حضرت مولوی [illegible] صاحب [illegible] تھے۔ نیز رؤیا و کشوف کی نعمت سے بھی سرفراز تھے۔ آپ کی [illegible] خاص تبلیغی جدوجہد اور روحانی ماحول میں گذری ہے۔ مولانا نے اپنی [illegible] داستان حیات کا تذکرہ " حیات بقاپوری " میں شائع کر چکے ہیں [illegible] دراصل " حیات بقاپوری " کا ایک ایمان افروز انتخاب ہے۔ [illegible] فاضل مترجم نے انگریزی زبان میں منتقل کیا ہے۔ ترجمے کا [illegible] ہے۔ پھر انگریزی زبان میں کسی مذہبی اور دینی تحریر کو منتقل کرنا ایک غیر معمولی کام ہے کیونکہ اس زبان میں اسلامی اصطلاحات کو سمجھنے کے لئے متبادل الفاظ مشکل سے ملتے ہیں۔ [illegible] مترجم نے اس مشکل پر نہایت کامیابی سے قابو پایا ہے۔ ترجمہ سلیس [illegible] قاری کی سہولت کی خاطر اسلامی اصطلاحات کی وضاحت کے [illegible] مفید تشریحی حاشیے دیئے گئے ہیں۔ جن سے کتابچہ کی افادیت [illegible] ہو گیا ہے۔

کتابچہ تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں [illegible] پیش [illegible] پیرائے میں بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں حضرت [illegible] جماعت احمدیہ کی مجالس عرفان کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ [illegible] جوابات کا یہ سلسلہ بڑا دلچسپ ہے۔ تیسرے باب میں حضرت مولانا [illegible] کے رؤیا و کشوف ہیں۔ اس باب کا مطالعہ ایمان افروز [illegible] زندہ دلیل ہے اس امر کی کہ اسلام جس خدا کو پیش کرتا ہے وہ [illegible] بھی اپنے پیاروں سے گفتگو کرتا ہے ان کی دعائیں سنتا ہے اور [illegible] وقوع پذیر ہونے والے اہم واقعات کی خبر دیتا ہے حضرت مولانا [illegible] تصویر بھی شامل ہے جس سے کتابچہ کے ظاہری حسن میں [illegible] اضافہ [illegible]

(ل ، م)

(۴) انجیل مرقس کا آخری حصہ

مصنفہ شیخ عبد القادر [illegible] صفحات [illegible] [illegible] کتابت و طباعت عمدہ [illegible] [illegible] ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ احمدیہ ربوہ

کتابچہ کے مصنف [illegible]

I-Manar

LIM-UL-ISLAM COLLEGE MAGAZINE

بسم الله الرحمن الرحيم

Contents

Vol. Two No. 3

1.	Editorial	Rashid Ahmad	1
2.	Letters to the Editor		3
3.	The Study of Man	A. R. Junaid Hashmi	5
4.	Fiery Red Ring	Rashid Ahmad	8
5.	Where the Bee Sucks	Shakespeare	15
6.	Science and Religion	L. Mamud, IV Year	16
7.	The Lute Played On	M. Rashid Akhtar, IV Year	22
8.	"To——"	L. Rahman Mahmood, IV Year	25
9.	An Evening At Khan Mir's	Rashid Ahmad	26
10.	Notes on Coleridge's Supernaturalism	Saeed Akhtar, IV Year	34
11.	Social Reforms	Rafique Ahmad, III Year	41
12.	On Reading	Hamid Ahmad, II Year	43
13.	Mathematics	M. Arshad, M.Sc. (Stud)	45
14.	Resurgent Africa	M. S. Conteh, II Year	47

★

PRINTED AT THE LION PRESS, HOSPITAL ROAD, LAHORE By A. R. Junaid for the T. I. College, Rabwah

Editorial

A sleepy little town ! even the slate-coloured hills of Rabwah seem to be on the brink of sleep. Moon beams sleep in ashen dust. Breathing winds stray silhouettes of rank nettles. Their shadows do not vanish like those of a bird. Enwreathing wafts of dreamy moon-light are waxed and warped. Stones of very many shapes are not fiery. Soft and cool like moon-rays ! Unless you strike one against another, they won't sent out sparks. Don't call them castaways !

A divine spirit that once shone about the sands of Bias now lives around the hills of Rabwah. It is more bewitching than the moon-light hills, more splendid than the shining moors softer than the ashen dust, and more fiery and swift than the flying sparks of mutually struck moor stones.

Pomp and vanity of this wicked world reporbate us. Stiff-neckedness excludes us from salvation. But the divine spirit does not cast us off. Its celestial light brightens all : a ragged water-carrier as well as a velvet-covered prince can absorb it.

If one could live like a solitary shoot of knot-grass ! It creeps under the stones, over the sods. It sprouts its flowers in spring and sheds them in winter. Someone sees it hung with beeds of dew : it is mute to his praise ! It is trampled when yellow and dry, no one hears its creeking plaint ! So unknown and so humble ! The divine spirit descends upon the humble. Do not move your lips even if your loved flower is struck down and crushed in dust. Knowing your loss you do not sigh out an appeal. Your soul is beautiful ! Raise your eyes to the starry cope of heaven and long for the stars. But do not like to overlook the lives of tiny pests. Do not kill them if they too pop out their heads. God made us all Love all !

Rabwah, the abode of the divine spirit craves for sweetness and beauty. When it sleeps and dreams, the spirit throws itself into ecstasies to see its hills, stones, dust, trees, nettles and brambles calm, quiet and peaceful, as if steeped in deep worship. The spirit frets a little when its breathing stones and stalks make noise and prate. It visualises this little town as the centre of the universe. All should kiss it !

Everybody on the go ! Like blushing blossoms ! Strange people would come to gather you. The sunny blue shores and sands of Greece and Italy would be deserted. Yes, the devine spirit has willed it so ! People, as many as the stars of galaxy, would some time come and wait to be ecstatised by the heavently sweet voices sung out from the minarets of this little sleeply town !

RASHID AHMAD

LETTERS TO THE EDITOR

Sir,

It will do 'Al-Manar' a lot of good if you disallow publication of articles on medicine, economics and geography.

◇ The suggestion is hailed – *Ed.*

Sir,

The magazine has become a solo show! Help shy artists.

A. Fateh.

◇ Sorry to remark that the students community has become 'passive bucket' stuff. Do me the favour of giving an inkling of the college intelligentsia—*Ed.*

Sir,

Where is the old man who used to write "Pin-Pricks"?

◇ His pin is blunt and needs sharpening! —*Ed.*

Sir,

Every clandestine plagiarist is the writer of the article "Peace and Islam"!

—A Plagiarist.

◇ He can't help it! —*Ed.*

Sir,

Mr. Zafar's translations are excellent. Where is his creative genius?

—Rashid.

◇ Lost in the labyrinth of laboratory!—*Ed.*

Sir,

Went through 'Student Club'. A horrible club indeed. What if the fiends are at the same table!

—Salim.

◇ See them in "An Evening at Khan Mir's."—*Ed.*

Sir,

I don't know if it were conscious or unconscious slip of your pen or a misprint but I deem it essential to correct it. Dr. Zhivago is the name of Boras Pasternak's novel, and not the writer himself.

—Akhtar.

◇ The mistake is regretted.—*Ed.*

Sir,

What is the touchstone of a student writer's literary success?

—Ahmad.

◇ You should be sure of success when you have gathered as many critical stones as possible! —*Ed.*

The Study of Man

BY

A. R. JUNAID HASHMI

IF you consider the present world population of 250 crores and add to it all the people who lived and died during the past 1,000,000 years, you will be interested, as I am, to study Anthropology. It is one of the newly-discovered sciences but its scope is tremendous. It is the science of man himself and his relations with other people. It has four or five aspects of two distinctive parts—Human Paleontology and Soma-tology.

Human paleontology deals with a survey of the changes in human physique since the man's origin. Our bodies today are evidence of change as the biologist Hanpttmann says : We possess, he asserts, more than 100 vestigial remains of earlier heritage, things which were once purposeful but are now physiologically useless and are gradually disappearing, such as the vermiform appendix in our intestine, the third molar (wisdom tooth), the coccyx, the last bone of our vertebral column, all toes on feet of man; extra ear-muscles around the pinna (some people can move their ears) and of course body-hair etc. Future changes can be predicted in height and weight, baldness among men, bulging foreheads etc. Similarly we can even now trace great human variations in human bodies. Just study the semi-erect, ape-like, man-like forms found in South Africa, the, big, gaunt stoop-shouldered Neanderthal men of 1,25000 years ago, tall-erect CroMagnon of the last glacial epoch who existed some 25,000 years ago. One of the important links in the chain of man's evolution is the fossil form Dryopithecus (oak-ape) found in Swalik Hills in India. This is believed to be the dividing point in the common ancestry of man and the chimpanzee.

No doubt modern researches have found abundant evidence to explode the myth that man descended from monkeys. We are now in a position to classify mankind in its proper biological relationship with reference to other animals. Through the study of syrums, it is now possible to establish exact relationship between related forms of men, apes and monkeys. Julian Huxley, the noted biologist had

rightly declared at the Karachi Science Conference that "we have been so concerned with the descent of man that we have failed to recognize the ascent of man who is today the dominant animal form on earth."

Somatology is the scientific-study of contemporary human forms and bodily measurements particularly with anatomical differences among different races of men.

Although it is true acecording to the scientists that all the living animals are descended from a single stock yet we also recognize variations in physique such as short, stocky slant-eyed mongoloids of Japan and Siberia, the tall long-limbed, puffy-lipped negroids of East Africa, long-headed and balding Nordics of Northern Europe and many other variations in these types. The Somatologistx is concerned with ascertaining the origin and causes of these anatomical differences. The colour of skin, eyes and hair is determined by the amount of pigmentation present which is presumed to be an adaptive characteristic enabling dark skinned-people to survive in tropical areas of intense sunshine. Body stature and weight are also related to climate. Studies show that the men of polar regions have longer trunks and shorter legs and are heavier than their southern cousins. The denser and larger a boy the more slowly it loses heat. Similarly tall, thin people have greater skin areas and hence more pores for throwing off surplus body heat so that they live more comfortably in hot climates. Now suppose the climatic and other fartors are suddenly changed these individuals will not be able to transmit the varied characters to their descendants. Other applications of Somotology are extremely practical, and have great influence in modern industry. For instance, clothing manufacturers measure the various types of body-build and ready-made clothes are designed accordingly. The same system is adopted in America, so ready-made clothes fit comfortably without alteration. Furniture also is being contour-designed for greater comfort. One of the typical problems which may come to a consulting anthropologist was told in a newspaper. A dental supply firm received an order for artificial teeth from their firm in India. Sometime after, they received word that the false teeth were unsatisfactory and were not selling. Why? The consultant found upon investigation that Indians felt conspicuous wearing dentures with pale-plastic gums and white teeth. While their friends whose teeth were intact had stained gums and pink teeth fromchewing betels. The remedy was simple—colour the dentures accordingly. Now the Indians were happily wearing their false teeth which are barely distinguishable from the natural teeth and gums of their friends.

Archaeolgoy is the study of former, cultures and museums are full of recovered articles of past civilizations. Modern archaeologists are tracing the orgin of our common culture elements that determine the causes of development of high civilizations in specific places, at certain times, in world history.

Ethnology is another division of anthrology and it studies contemporary non-literate societies, such as Todas of India—Eskimos of the North, the aboriginals of the South pacific and "pigmies" of central Africa. It helps to solve some of the world special problems. Linguistic is another sub-division of anthropology. It not only classifies different languages and racial history through word-similarities, but also demonstrates control which language may have upon our thought processes. Much of our world tensions and misunderstandings arise from an inability to communicate effectively between various languages. The same word in two different meanings. For an example, consider the feelings of the American Parents working in U.S. Embassy in Moscow who received a telegram concerning their daughter at school in America. The telegram was originally transmitted as :—

"Alice has been suspended for a childish prank." But by the time message had been translated into Russian and then again into English, the parents were shocked to read, "Alice was hanged for juvenile delinquency." Similar instances can be cited between Urdu and English versions.

Anthropology is a vast subject and laws of human nature can be formulated by its study. It attempts to bring together into a single body of knowledge all the particularised facts about human beings to enable us to see their inter-relationships.

FIERY RED RING

BY

RASHID AHMAD

It was Sunday. The sun was shining brightly and its mellow ligt sank into the cold skins of winters-tricken people. Lingering smiles on thawing faces showed their relief and respite from having been, the whole night long, petrified by cold. Men apart, even birds were seen enjoying the sun-light and were flapping their wings. They flew with ease and swiftness as if they were filled with buoyant and restless spirits. One of them swooped down and its white feathers gave out a flash of light. They flew about in search of food. They perhaps wanted to satisfy their appetite and also put beakfuls into tiny red mouths of their young ones.

With their grey over-coats well-pulled over their bodies Rask and Ahmad were passing through a broad street flanked on either side by fashionable shops. The street was sparsely littered with people, as they thought it better to enjoy the sunshine on their balconies than to go out shopping in the morning. Many shops were locked. Here and there a shop was seen open with its keeper gathering himself in a nook of the counter. He defied cold and seemed lost in expectation of money; with half-closed eyes he felt the touch of cold coins in his palm.

By now Rask and Ahmad had gone pretty long way up to the end of the street. They paused before a shop. It was full of articles of general use. From a toy to a radis set, it contained almost all things which are needed by man-in-the-street as well as by a man-in-the-car. It could decorate equally weil a modest house as well as a palatial building of an aristocrat.

Rask was a young man of moderate means. Ahmad was a wealthy man. But as good friends they were, their minds seldom thought of the great disparity between the dusty and uneven earthen floor of Rask's house, and the cemented, polished and gleaming floor of Ahmad's grand mansion. A queer thing bound them together. They loved the same girl. Both offered fresh flowers at the shrine of thir love, who seemed, to all appearances, equally sympathetic and responsive to their advances and addresses, but her heart throbbed at the presence of only one of them. Her eyes sparkled

with wild joy at the sight of only one. Her frail nostrils dialated at the fragrance of only one's roses. She put only one's flowers in her hair. The other's flowers faded, dried up andreturned to dust, complaining in vain of carelessness and forgetfullness.

Rask and Ahmad were choosing rings for their beloved. The jeweller had placed many rings before them. Some were studded with green stones and some with red. Some shone with blue stones and some with colourless stones. All rings carried their respective colourful charms and could fit any delicate finger. But the two men would excel in their choices. They would try to emulate each other in winning smiles of admiration and sweetness from their beloved. They discussed the worth, colour, stability and lustre of each. They had also some inkling of the likes and dislikes of their beloved. So they tried to hit the mark and get elevated in her eyes. But they clearly understood that the ring of the man whose intense love she requited with intenser love would be accepted, the other being thrown aside with all its beauy. The beauty of the ring did not matter. The man who chose the ring really mattered to her. So the young men tried in vain. The choice of one of them was fated to be hailed and liked. The choice of the other was, however, hard he may try, destined to be put aside. Rask said to Ahmad at last:

"Ahmad ! After all I have decided to stake my life on this red ring."

"But red colour is ominous and odious, you know ? It signifies blood."

"I can't help. My heart likes it. My eyes sparkle to see it. It is as red as her cheek."

"Red colour seems to be excitingly hot and hectic. It foresees flesh freshly cut and weltering in jets of hot blood. It boils."

As Ahmad said that he closed his eyes as if he really saw some butured flesh.

"I like only the red ring. It is like one of the roses which I send her daily and which she pins in her washed locks. Maybe it wins her over to me".

"And I unhesitatingly pick up this blue one".

"Does it not signify a turbulent and bulky rapid ready to dash one to pieces ?"

"It is as calm as the undisturbed deep of her lake-like eyes. It is peaceful."

"She is fiery and swift."

"No. I have never seen her so"

At length Rask chose the red ring and Ahmad the blue one. They put their treasures in their pockets, paid their prices and slowly walked off.

They offered their tokens. She received both the rings with equal condescension and affection and wore the two rings one her either hand. She did it before their eyes. They thought oblations had been accepted. They were happy. But as the backs of the two were turned

upon her she removed the blue ring and put it aside. She feasted her large eyes upon the rich red stone of the ring and put it to her surging breast.

She was fiery and swift as the spirit of a gazalle. She had large eyes, their corners stretching into her broad lineaments. The turbulent blue lakes of her eyes were covered with the long weeds of her black lashes. She had long hair like the gloden fibres of jute. Her oval face was strewn with many a red rose. Her neck was stately like that of a white heron, her breast was like that of a dove beautiful and soft. Very shapely she was. As she was physically exquisite and beautiful, so was her mind. She had a taste for the beautiful, and the sweet. Because she herself was so. And she saw the images of her own beauty and sweetness around her. Here love was eternal and sweet like the flow of a stream and the music of its murmuring water.

Rask and Ahmad were two types of humanity. There was nothing dramatic or unusual about them. Their intellectual achievements were of a high order. Rask had done post-graduation in English literature. He was sensitive. He was awake to the minute susceptibilities of human nature. Important things made indelible impressions upon his mind. He was fond of retrospections. Things having a look of antiquity, obscurity and vagueness merited his observation and invitted his sympathies. Incidents and episodes of past, however, painful and twisted, caught up with his imagination, and he took delight in looking back upon the past. He himself wore a look of abscure melancholy and vague jollity. He dallied with his own thoughts. When he was away from his beloved he made a beautiful toy of his thoughts and rolled it before his eyes. It was his daily routine to go out in the morning, retire to some garden, pick choice flowers and offer them to the advancing hands of his beloved.

But when he saw yesterdays' flowers fast withering, his heart rolled in ecstatic pain. Silently and constantly he continued adoring her.

Ahmad was an aristocrat but his heart throbbed with no mean sympathies for those who were looked upon as dirty pests of society. Only he could not express his sorrow at the misery of his fellow-creatures. He felt their keen sorrow, but he felt ashamed to relieve them. He looked a princely youth. He could move in any society and control it with his spontaneous wit and rich know-how of the world-affairs. Many maidens sighed for his partnership but his looks were fixed upon one whom Rask too loved. Ahmad was full of great expectations. He had hopes of her betrothel. He waited.

Ahmad extended an invitation to Seema. She condescended to accept it. They were dated to meet at Cafe Dawn. This casino

was the rendezous of men of fashion and letters. Tea chats, coffee talks and beer sallies made the casino alive. Light music also softly gave out shimmering tunes which faded slowly into the slight murmur and noise of its frequenters. An occaisional burst of laughter resounded the casino. Everybody poured his little, broken philosophy of life. Storms were astir in tea cups New loves pledged everlasting fidelity. Bitter differences were kissed into conformity and harmony of mutual understanding.

Ahmad chose an obscure corner of the casino and retired to it. He dragged one chair and sank into it. He was sad. He now heard music, now sipped tea. He could not be at rest. He burnt within and twitched without. Minutes seemed hours. Suddenly he looked round the corner and Seema stood before him.

She smiled and gathered her woolen dress about her. She stood and bushed. Ahmad's whole gloom was shaken off at her appearance. She had, it seemed, covered that barren and deserted corner with so many flowers. With dilated eyes he looked at her. He smelt her fragrance.

"Will you take your seat, Seema ?"

She sat oposite to him.
"Will you like me to order for coffee ?"

She only smiled. Coffee came. She sipped with little smacks of her lips. He looked at her. He looked for a long time. She condescended to receive his stolen glances.

"Did you read Evelina ?" said Seema.

"Yes : I read it two years ago."

"How wonderfully Burney has depicted the difficulties and intricasies which confront a girl in her teens, and how she smooths out the tangles of society. It helped me a deal."

Ahmad's glances travelled from her face to her fingers which played with the cup of coffee. "How soft and well-shaped her fingers are ! Just artistic enough to hold a brush and paint pictures ! He thought.

"Ahmad, what are you looking at ?"

"Nothing."

But his eyes were fixed at her fingers. One of them held the ring with the red stone. It shone brightly The blue ring was no where. He searched it on all her fingers. Perhaps his eyes deceived him, he thought. But why could not he just see the blue ring ? Where was it ? It had dropped somewhere. It was loose. It could not excel the red one in brightness. It slipped off by itself. It might be lying in dust.

"Waiter !" he cried.

"What do you want ?" innocently she asked,

"I want beer. I badly need it. There is fog stuck in my throat. I want to melt it. There is mist before my eyes. I can't see clearly."

"Bring strong beer !" he ordered the waiting servant.

But you never took bear. It is the first time you have ordered. Isn't it strange ? Please do not....." She protested.

"It won't do any harm. It is not bitter. It is sweet as love !

A light song was in the air.

"Many a tipsy damsel slips by me and secretly looks about. Which one is the for me ? Whom I am for ?"

"How sweet is the song !" Ahmad said in broken syllables.

She was afraid of getting late. The twilight lingered outside. She looked out. It was time to go. She rose.

"Shall I escort you a little way ?" Ahmad asked.

She was afraid of his flashing eyes and quivering lips.

"No; you need not bother about me." She wanted to go alone.

"Thank you for the company. We had a good time. You made me happy. God give us another chance like this."

She expressed gratitude and left. Ahmad saw her off at the door. He stared at her. He continued gazing at her till she was lost in the darkness. Her woollen dress fluttered in the floating mist before his eyes. Her voice echoed in his ears. With unsure steps he too wended his way home.

How weak is human element ? It is so brittle. Man becomes weaker when he seeks support of a still weaker element of human species : woman. How a little act of fair sex sometimes decides his line of life? Vitals of life are torn into shreds at a doubtful or or dubious inclination of a woman. Her looks make the scales fall from his eyes. A tough man disintegrates and scatters into pieces when it clashes with a frail woman. Woman excels in her devastations. Knowingly or unknowingly she is the cause of man's fall. And he knowingly chooses her as his ideal. End is tragic. Love of woman discards friendship. Old ties are broken. Sodid Ahmad.

The two old friends were going along the road. Ahmad's hand was in Rask's hand. Lingering light of the sinking sun gave a red glow to their faces.

They were often seen together. They frequented the same places. They chummed the same room in their school and college days.

"Rask, you are very particular about weather. What about this evening ?"

"It is cold and keen.

A cold wind too seems to be astir."

"It would not check us from going up to that sandy mond beside the canal. We would rest a while."

"After that we should hasten home-wards. The sun has just gone down."

"But the new moon comes out tonight."

"That is equal to star-light."

They reached the bank. And they sat there. Rask felt tired.

He looked at the reflections of lingering and shimmering redness. The water moved slowly and silently. Ahmad saw Rask lost in in his thoughts and said :

Dear Rask ! You enjoy the scene. I return with a reed. It will make a good stick.

Ahmad went into the long rank reeds, and took out a knife with a long crescent-like blade. It shone. He placed it at the stem of a reed. With careful, clandestine and light steps he went up to the bent back of Rask. Rask was squatting with his head buried in his hands.

Ahmad raised up his hand and sank the whole blade into his back. Rask moved no more. He did not even give out a groan, nor a shuffle of feet.

"The red ring shall shine no more!" Ahmad uttered the words in hysterical manner and was lost in thick darkness of the evening, the crescent having gone down.

The next morning Ahmad chanced to pass by Seema's house. She met him. He requested her to pass the noon at the same tryst, Cafe Dawn. She complained of sore throat and expressed her inability to enjoy a chat with him. But she condescended to meet him at Cafe Dawn, the coming evening at five. He was happy. He let a smile of satisfaction sail on his lips for not being asked anything about Rask. His face would have turned pale with fear, had she invoked the wandering, tossing soul of Rask. Rask was alive for her. She was alive for him !

Cafe Dawn was humming with life. Faces flushed and rouged with the warmth of wine and the reflecting colours of wineful chalices mustered courage to mix with one another. Rugged and rough hands brushed against the delicate and soft ones. Fairy-like faces blushed and reblushed at clandestine remarks of their partners. Somewhere flesh was with flowery sensation of hypocrisy, being softened into submission, and somewhere it was, with elquence of tongue, being stirred to disseminate its warmth with that of soul. Some past deeds were being rued and some new deeds were being dreamed of. Some literary minds were vexed with the opening of their master pieces and some with the ending. The laboured and tired ones werer enjoying papers.

Ahmad, in high spirits and in great expectations, entered the casino. He spotted his favourite corner and hastened towards it, lest it should be occupied by any other than himself. He took one chair and kept another under his eyes.

He had come one hour earlier than the appointed time of meeting. Perhaps he wanted to prepare himself for the befitting and lusty welcome he wanted to extend to Seema.

After waiting for sixty minutes he again and again looked towards the door. She was a woman of her word. She never betrayed him. But how could she forget her date this evening ? Many scruples came to his head. She might have come across some pressing duty. After all she would come.

He ordered coffee. He had already emptied two cups. He

drank it slowly and thoughtfully. His eyes continued looking around. Looking up at the hanging disc carrying many burning candles he beheld a cluster of moths flying round them. They flew about the hot flames. Suddenly one of them flew into the flame and there it was burnt up. Antother followed. It met the same fate. Why they died for the flame? He thought. They had tiny, beautiful, colourful wings with which their lives fluttered. How soon they finished themselves! For blazing light of the flame! Not the slightest bit akin to them! They might have lived a few hours.

He was distracted when someone rustled by him. In place of Seema, a friend of his stood before him.

With sad and sober words Ahmad welcomed him to a chair and asked if he would have some refreshment.

"No. I don't need anything. I just want to break a sad news to you. Perhaps one girl, Seema by name, was, I recall, your friend. You once told me that. She committed suicide. Just one hour before. She was found dead with a tear-bedimmed portrait of your friend Rask, and a small ring with a red stone was lying beside her."

SHAKESPEARE

'WHERE THE BEE SUCKS'

Where the bee sucks, there suck I :
In a cowslip's bell I lie ;
There I couch when owls do cry.
On the bat's back I do fly
After summer merrily.
Merrily, merrily shall I live now
Under the blossom that hangs on the bough.

A riel in

The Tempest, V.I.

Science and Religion

By

L. MAMUD, IV Year.

"I believe in Islam as it teaches that there can be no conflict between the world of God and the work of God, and thus resolves the supposed conflict between the Science and the Religion."

Head of the Ahmadiyya Movement.

THE topic "Science and Religion" is a vexed question. This moot-case is being discussed in religious and educational circles throughout the world. The Intelligentsia is divided into two blocks. One community says that science is an absolute truth while religion is a rubbish heap of falsehood and non-sense. They feel that religion is an huge obstacle in the path of intellectual and material progress of mankind. They believe that old philosophies of religious dogma are merely hypothetical and superstitious. Bearing in mind the uselessness of religion, they regard science as entirely different from religion. According to their self-made rule everything which contradicts scientific theories and law, even apparently, is quite untrue and baseless.

The other group is of the opinion that science is a sort of disastrous movement based on the principle of scandal-mongering. According to them, religion due to its purity and spiritual excellence is some thing which is free from the fatal impurity of the scientific sense and reason. They feel that it is the science that strikes at the very root of the lofty castle of spirituality. Such a thing can not be true and useful.

As far as the topic is concerned, I consider, both are wrong. I feel that a sort of unbridled intellectual prejudice is ruling over their tongues and pens. In reality the mean of these two extremities gives the right path. Each and every word, fortunately or unfortunately, uttered by a scientist can not be essentially true. History bears ample testimony to this fact. In the near past, A put forth a hypothesis, B discarded it. Anyhow the truth of a hypothesis cannot be taken as granted. Similarly science is not entirely devoid of religious light. I do not think with George Bernard Shaw that science is always wrong. It is

foolery to think that science is the enemy of a true and living religion. True, religion is always and everywhere provable. The truth of a living religion is a dazzling light and it cannot be extinguished by the tremendous velocity of fleeting time. Poor germs cannot poison the blood running in the arteries of a living belief! In short, a true religion cannot be destroyed. It is an invincible fort. Science is a humble servant of a true religion and not a bitter enemy.

Religion may be perceived in two ways—Divine Revelation and the Study of Nature. The terms "Revealed Religion" and "Natural Religion" are derived from the same thought. Natural Religion is the religious knowledge acquired by a keen and sincere analysis of natural phenomena. By the Revealed Religion we simply mean the knowledge of God revealed by him. In simple words the revealed religion is the word of God and the natural religion is the work of God. And what is Science? Is it not a suitable key which opens the mysterious lock inserted at the door of natural religion? God has invited man's attention towards the analysis of natural religion. Holy Quran says:

ان فی خلق السموات والارض واختلاف
الیل والنهار والفلک التی تجری فی البحر
بما ینفع الناس وما انزل الله من السماء من ماء
فاحیا به الارض بعد موتها وبث فیها من کل
دابه وتصریف الریح والسحاب المسخر بین السماء
والارض لا یت لقوم یعقلون *

"Most surely in the creation of the heavens and the earth and the alteration of the night and the day and the ships that run in the sea with that which profits men, and the water that Allah sends down from the cloud, then gives life to the earth after its death and spreads in it all (kinds of) animals. And the changing of the winds and the clouds made subservient between the heaven and the earth, there are Signs for a people who Understand." (Ch. II vs. 165)

The Maker of the universe invites us to open this lock. Science is nothing but good and proper use of five senses. It is not condemnable. Therefore we should not rebuke this science. On the other hand it is useful in determining the straight and clear path leading to the truth. Strictly speaking, each and every particle of this universe is obeying a certain law, the Law of Nature. The unique harmony existing in the systematic arrangement of our most enigmatic universe is an irrefutable evidence of the Unity of its Maker. God challenges the man:

ما تری فی خلق الرحمن من تفوت
فارجع البصر هل تری من فطور *

'You see no incongruity in the creation of the Beneficent God; then look again can you see any disorder?'

(Ch. LXVII: vs. 3)

The same ideas are expressed in the following verses of the

holy founder of the Ahmadiyya movement :

(۱) ہر دم از کاخ عالم آواز ایست
کہ یکش باقی و فنا ساز ایست

---

(۲) کس قدر ظاہر ہے نور اس مبداء الانوار کا
بن رہا ہے سارا عالم آئنہ ابصار کا
چاند کو کل دیکھ کر میں سخت بے کل ہو گیا
کیونکہ تھا کچھ کچھ نشاں اس میں جمال یار کا
ہے عجب جلوہ تری قدرت کا پیارے ہر طرف
جس طرف دیکھیں وہی رہ ہے ترے دیدار کا
چشمہ خورشید میں موجیں تری مشہود ہیں
ہر ستارے میں تماشا ہے تری چمکار کا
کیا عجب تونے ہر اک ذرہ میں رکھے ہیں
خواص کون پڑھ سکتا ہے سارا دفتر ان اسرار کا
تری قدرت کا کوئی بھی انتہا پاتا نہیں
کس سے کھل سکتا ہے پیچ اس عقدہ دشوار کا

The famous poet of nature William Wordsworth draws our attention towards the significance of the natural phenomena. He says about nature :-

'she has a world of ready wealth
Our minds and hearts to bless—
Spontaneous wisdom breathed by health
Truth breathed by cheerfulness.
One impulse from a vernal wood.
May teach you more of a man,
Of moral evil and of good,
Than all the sages can.
Sweet is the lore which nature brings ;
Our meddling intellect.
...."

But the scientific analysis of mysterious nature is not a simple job. Very careful attention and keen sense of observation is required. Divine light to enlighten the line of action, is very essential, because according to Cowley "Godless science reads nature only as Milton's daughters did Hebrew, rightly syllabling the sentences, but utterly ignorant of the meanings". Therefore for God's sake don't play the part of Milton's daughters—don't read the book of nature using Godless scientific lens. Otherwise Wordworth's "Sweet Lore of Nature" will acquire the taste of Mackworth's "Fearful Cup". F.B. Cobbe has rightly felt that science is but a mere heap of facts not a golden chain of truths, if we refuse to link it to the throne of God". When you will study the Natural Religion in the light of the Revealed Religion, truth, will become clear. It should be noted that origin of the two is the same, the Maker of this Universe. These two may be regarded as two images of one source of light. If it is so then there should be no parallex between the two. In other words there should be no discrepancy and fluctuation between the two religions—the Revealed Religion and the Natural Religion. The true religion and the true science. Certainly the arrival at this result will enhance our faith in the existence of God and His Oneness. I would like to repeat the words of Sir David Brewster "Science ever has been, and ever must be, the safeguard of religion."

One thing more. We have a very vast and spacious picture

of the work of God before our eyes. But what about the Word of God? There are so many religions on the face of the globe and so is the number of their sacred scriptures. Hindus have their ancient Vedas. Jews and Chiristians possess the Old and New Testaments, Muslims believe in the Holy Quran. Similarly others attach themselves to the religious books of their own. Each sect claims that it's is the word of God. But strictly speaking it is not true of all the books. Only the Quran, which was revealed to the Holy Prophet of Islam (peace be upon him), can be regarded as the only living word of God. The reason is that the languages in which other books were revealed are dead ones. Now-a-days they are being published in the spoken languages. There are radical changes in their texts, even between the latter and the latest editions. The text has been changed and it is being changed at will. And this process is an open secret. Those books were certainly the Word of God but man has introduced so much that to-day we are unable to differentiate between the "actual" and the "artificial". On the other hand the Holy Quran is wholly, soley and purely the Word of God. Arabic, the language in which it was revealed is being spoken and understood nearly in all Islamic states. Its text is the same as it was 1376 years before. In the light of these facts, only the Quran can be called the Word of God.

Let us see is there any contradiction and incongruity between the Word of God and the work of God?

---

1. Existence of Sex in Plants.

It is a new discovery. This theory has been produced after a very laborious research work. The rich growth of flowers and fruit is due to the sexual copulation which is brought about by several natural agents (winds, insects, water etc). It has been proved that plants also have sexual organs. Holy Quran acknowledges the fact:

سبحن الذی خلق الازواج کلها مما تنبت الارض -

> "Glory be to Him who created pairs of all things, of what the earth grows."
>
> (Ch. XXXVI vs. 36)

ومن کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون *

> "And of everything We have created pairs that you may be mindful".
>
> (Ch. LI vs. 49)

---

1. Floatation of Heavenly Bodies.

We know that the sun and its satellites constitute our Solar system. According to Nicolas Copernicus', theory the sun is at the centre of the system and Mercury, Venus, Earth, Jupiter etc. are revolving round the sun. The moon moves round the earth. It is carried along by the earth in its movement round the sun. The Holy Quran says:

(۱) والقمر قدرنه منازل حتی عاد کالعرجون
القدیم * لاالشمس ینبغی لها ان تدرک
القمر ولاالیل سابق النهار ط وکل فی فلک
یسبحون *

"And (as for) the moon, we have ordained for its stages till it becomes as an old dry palm branch. Neither it is allowed to the sun that it should overtake the moon nor can night out strip the day: and all float in a space."

(Ch : XXXVI vs 30-40)

3. Floatation of the sun.

Like other heavently bodies the sun is also in a state of perpetual motion. Holy Quran says :

(٢) الشمس والقمر بحسبان *

"The sun and the moon follow a recokoning".

(Ch : LV. vs. 5)

(٣) والشمس تجرى لمستقر لها ط

"And the sun runs on to a term appointed for it".

(Ch. XXXVI vs. 37)

In fact there are many solar systems like that of ours. All these Solar systems constitute a "Galaxy" or "Stellar system". Telling about it Mr. Flecker says :

"The Stellar inverse, that is, the whole of space in which there are stars, is shaped like a sphere or globe. The centre of the sphere is at a distance of about 30,000 light years from the sun, which, together with the neighbouring stars, is moving in its immense orbit around the centre at the tremendous speed of about 170 mile a second carrying the planets with it as it goes. But because of the smoothness of the motion and the absence of any sudden changes in speed or direction, we are not any more conscious of its motion than we are of the speed of 18 miles a second at which the earth moves round the sun. In spite of its tremendous speed it takes the sun about 225 million years to complete one revolution in its orbit. Our whole stellar system or glaxy as it is often called consists of something like 150,000 million suns like of our own. And there are many glaxies besides, all rotating, all seemingly travelling away from us; and at more distance they are the more rapidly are they moving away. Some are trevelling at the rate perhaps 47000 miles a second."

4. Moon is a Non-luminous Body

It is visible only by the sunlight which is reflected from its surface. Holy Quran says :

وجعل القمر فيهن نوراً وجعل الشمس سراجاً *

"And made the moon therein a light, and made the sun a lamp (a source of light."

(Ch. LXXI vs. 16)

Here the word نور conveys the meanings of the "reflected light" showing that the nature of moon is different from سراج the source of light. Scientists have proved that on Lunar mountains the sun-light falls throughout the

year, irrespective of our day and night.

5. The Earth is round like a sphere.

The ancients believed that she was flat but the Holy Quran tells that it is round in shape. The verse

ربالمشرقين وربالمغربين *

gives rise to the idea of her being round.

"He is the Lord of the two Easts and the Lord of the two Wests"

(Ch: LV, vs. 17)

A few examples have been very briefly discussed. A lot of work is left behind. I request the readers of the 'Almnar' to continue this interesting series and with this request finish the present essay.

[One light year is equal to : $186000 \times 60 \times 24 \times 30 \times 365$ miles.]

THE LUTE PLAYED ON

by
MUHAMMAD RASHID AKHTAR
IV Year

A gentle touch aroused princess from her light, fitful and broken sleep. Her red swollen eyes that were as full of suffering as of grace, her pale cheeks, her dishevelled, scattered hair that played on her chest, her glowing forehead, all betrayed the tumult in her soul, the turbulance in her mind and the sickness in her heart. She answered the greeting of the waiting woman with piercing taunt. The mind, stunned and surprised raised the curtains, placed a nose gey of resplendent flowers on the mantlepiece, opened the windows and stole out of the room. The feverish night in which she tossed her head violently, heaving deep-fetched sighs, had demonstrable effect on her person and form. What on earth can ail the princess ? She had no bodily disease. She had a good constitution, her organism worked wonderfully well. Certainly the malady was purely mental. The life appeared to her dull, inane, charmless. Formerly, everything was steeped in dazzling brilliance, now, the objects lost their freshness and glory. She became unsusceptible to ecstatic delights and exciting pleasures. The thought of mortality of man and vanity of universe recurred to her and swamped her being. In fact the cup that contributed to an interesting and animated existence, was drained. And perhaps the "discord was falling on the music of her soul". Her condition deteriorated in no small measure by her constant brooding over these problems.

The princess yawned drowsily and listlessly walked to the casement, only to see how nature bloomed, and mocked at her with sublime indifference. She, however, went on with daily programme, in which she was drilled, by the mere force of habit, without feeling any zeal or zest.

As the sun, after his day's hard labour, lingered in the west, the princess, with paleness loitering on her face, stepped in her garden to breathe the fresh, flower-scented air, and lolled on a marble bench. Suddenly a voice sweet and bewitching, arrested her attention. It soothed her soul, alleviated her pain, mitigated her anguish and dispelled her gloom. She danced unconsciously

to the lilting tune of the music. She rose and fell in unison with it. She drunk it deeply, inhaled it fully, bathed in it; she was lost in it, absorbed in it, engrossed in it; it captured her soul, it captured her heart, it captured her whole being. Enchanting melodies had thawed the ice that had accumulated in her head. The snow melted into water, which like inextricable currents swept all the lethargy and apathy. "I must find my benefactor at any cost." The capricious princess resolved and heedlessly proceeded on her reckless adventure. She seized her pleasure-boat; the oars splashed in the water, and the boat glided at a brisk pace.

Fast failing, feeble sunlight, fell and played on the calm river; the trees on the banks cast their serene shadows on dusky water. The hoary and haggard fisherman retired to his little dreamy hut. The sunburnt, youthful, shepherd drove the flock through many glades and mossy paths strewn with wild flowers. Weary caravans of birds silently settled on sallows.

Dextriously she steered her boat smoothly in evening glooms. Reaching ashore, she anchored it with a plank and hustled towards a certain direction. After following the meandering jungle paths she saw a tall, burly, swarthy, sinewy man in his thirtees, with tanned face, accustomed to stand climatic rigours. His long, pitch black, locks fell on his shoulders, his large black eyes had an extraordinary brightness inspiring awe and reverence. He was seated on a mossy stone playing on a lute in a wild ecstacy, with utter disregard of the things about him.

It must be borne in mind that every eastern hermit cloaks his sympathy and good-will, with a show of roughness, to encourage only really distressed people, and to scare away the idlers who swarm at every novel thing for fun and amusement. So, his looks had nearly scared her and she was in a flurry, but soon she nerved herself up and stood before him with humility.

Hermit: (sternly) "Who are you? and why have you come here?"

Princess: (in a low but tender voice). "Pity me, holyman. I have lost the tranquility of mind and peace of soul. My ample spirit flutter in temporal din. I have flown to find solace and comfort."

Hermit: (softening). "Your rich attire scattered with jewels and pearls reveals that you live in luxury. Verily the earthy splendour and grandeur smother the bud of our soul. Blessed are those who remember God in comfort and distress, in plenty and poverty.

Fair girl, you must bid eternal farewell to all your former pleasures and live like a nomad, a simple life under the soothing influence of nature. The lush green grass, the murmuring brooks, the wild flowers, the morning dew, the starry nights, the summer

clouds and above all this lute-nectar for sick soul shall cure you. (After a solemn pause). But are you prepared to endure the privations of such a life."

Princess : (with determination) "I shall bear every hardship cheerfully, holyman ! "

The darkness palled the universe, and the landscape merged in the shades of night. The man opening his pouch, gave her blankets and a greasy, pillow to sleep on. After promising to meet her early in the morning at the crow of first cock, he slid into the wood.

Cool night winds blew across the wood, the leaves fluttered and rustled mirthfully. The soft, silken moon-light lulled everything asleep. Another hour and the princess roamed in golden dreamy islands. At about midnight a rhythmic fall of footsteps startled her from her sleep. She saw, on opening her eyes, the swarthy hermit stalking stealthily to her in languid moonlight. His eyes flamed with unbridled lust and devilish delight, his face being lit up with many a sinister smile owing to the expectation of easy triumph over his prey.

"You despicable, shamefaced, sneaking hound !" The princess cried contemptuously and ran to her boat.

"Halt you hussy !"

The pedatory anchorite barked. But fair princesses would never turn her head, instead, she jogged on, though sometimes brambles and briers impeded her, at full pelt to her destination. Her velvety hands dragged the boat, the bracelets rattled, and her chagrined face was sprinkled with many "drops of anguish moist and fever dew". The boat floated swiftly till she quenced its speed in bank-slush. The crow of first cock saw the princess in her spacious bedroom. No sooner did she flung herself on the fluffy bed, than she was fast asleep. When she awoke late in the noon, she was a changed. woman. All her former lethargy, languish, sluggishness, sullenness, peevishness, listlessness, disappeared like a wild dream.

Now her pale cheeks had a spring-flush and a deep blush, her tell-tale eyes sparkled with gaiety, her lips smiled sweetly and made many a playful spout. She participated in all the functions and activities cheerfully. Her betrothed, knight, who laboured hard to curry favour with princess, but received rebuff after rebuff, was surprised and delighted too, when his fiancee warmly greeted him wreathing her arms round him. She also apologised for her acridity and rudeness. She fell in a long tete-a-tete with him discussing a wide range of subjects—from Persian cats to honeymoon resorts.

What a speedy recovery ! Thanks to the efforts of swarthy hermit !

"To........................"

1. In dreary calmness of dead night,
In horrid trap of Cupid blind
I see a face — a flash of light,
Then a knock at door of mind.

2. Fair is the hand ! Fair is the knock !
Sweet — like coo of melodious dove !
Clear — like sound that comes from rock,
Where songs are sung in praise of love !

3. Fair hands knock as feathers fall in showers !
As images touch the slab of glass !
As sweet dawn gives aroma to flowers !
As pearls of dew kiss blades of grass !

4. But gone are days when heart was broken —
And tower of love was turned into chips.
O Friend ! this knock is a precious token —
It reminds me of Your rosy lips.

5. Allow me to see Your charming face —
My tearful eye is like flooded land,
And poor heart like deserted place,
Which is filled with burning sand.

6. Live coal of heart is emitting light —
My soul is wandering like cooing dove —
My life is like a sleepless night —
O Friend ! Is it the reward of love ?

7. Perhaps I am waiting for a glorious day,
When by chance, my Friend will smile,
And heart will be filled with flowers of May,
And tides of spring will come for a while.

LUTFUR RAHMAN MAHMOOD
B. Sc. (Final)

An Evening at Khan Mir's

by

RASHID AHMAD

SOME story-writers like to open their stories in casinos, hotels, restaurants or bars. I too open my story in a hotel run by an aged man, Khan Mir by name.

It is a story without any plot. Nor does it end with a proper climax that is vital to a story. After reading it you will either curse me or just go through it without wishing ever to meet me. Foolish enough I boldly and impudently confess that what I am going to write is not worth living on paper. But I will, in the teeth of opposition of my own pen, try to coax it to scratch some thing: my efforts may end in smoke or may fructify, my pen may draw caricatures, cartoons or effigies of words or it may create very many pictorial images unmatched in any language. The first thought is foremost in my head and thus to be readily fashioned into words.

My pen likes to be at large, to write at random; it likes to know no limitations. It can't be bound to certain loyalties. Nor it will be under anybody's obligation. Let it be given licence of expression. And I give it whole-heartedly.

"What is the best humour of 1959?" Mr. Free opened the conversation in a jovial mood. Perhaps he wanted to have the upper hand and the better of us all. But he was wrong. He shone in one or two introductory sentences. Then he subsided. And stared and gazed at our faces. A little monkey he was. He thought it conforming to his nature and congenial to his environment to monkey words sounds and gestures. How could he think of new things? Nothing new came to this head. Everything stale and bad smelling! Like an old dog, the victim of a contagious disease, now dead and rotting in sun, and a skyful of old coots hanging over it!

"You rob me!" I threw the words at Mr. Free's face. They struck him hard. I did not like to satirise him and sting him in such a secret and subtle way as the old classic master Pope did. But Mr. Free knew the worth and significance of my words. He lost his colour. His face betrayed his skin-deep emotions. I knew he never felt his soul astir. He had

sold his soul to the Satan. He usually told us that he was rueful at having lost his spirit for ever. It could not be returned to him. Once lost it was lost for ever. What did he get in this bargain which he struck with Satan? Nothing good. Only brazen impudence! God strike him dead! Not once, but thrice, nay nine times nine!

"What a foolish humour! To consider the sentence "You rob me" as the best humour of the gone-by year! Ha, ha! It is as worn-out as the checked-coat which I have been putting on since I ran from school and which has kept passing on from one generation to another. No sane son would call it a humour worth talking about." Mr. Free boasted but he could not defend himself. He was going to squeeze his tail between his hind legs and show his heels when I caught hold of his fallen ears and dragged him near me. With faithfulness and mock-seriuuess he listened to me.

"First, because you have been robbing me of my money the whole year long. Second, because I have been taunting you during 1959 that I care a hang for the mild stimulous which you applied to my pocket which opened to your deft and talented fingers. Third, because it carries an appeal to you: do not rob me please. Pity me and my pocket in 1960." Mr. Free, after hearing my words roared with a peel of awkward and hollow laugh and at once became serious. He soon dozed. A lean and lanky loon! He did not know how to sleep: with one corner of his mouth open and hanging on one side, and a thread of sticky salvia coming out of it; one eye lashless and half-opened told us about many a dream it was dreaming. Everything he had, it seemed so to me at least, alienated from him. He was good enough not to snore, without snoring he looked a painted fool!

Mr. Smoke put his burning cigarette on Mr. Free's hair. It burnt. A very unpleasant smell was diffused. Mr. Smoke laughed. His mouth was fully open. It seemed as if his mouth would be cleft. Inextinguishable laughter kept his mouth very fairly widened. His roar disturbed Mr. Free's sleep. He got up and demanded tea in a commanding tone. Tea came. Money came from my pocket.

"I shall, with the entrails of his grand-father, strangle him who snatches my cup from my nervous hands. Keep back you parasites." threatened Mr. Free.

"Stay O gouty prater!" Mr. Bulk pulled up his loose pants and tightened the belt over his round, protuberant paunch. Mr. Free could not withstand the menace of his paunch. It moved towards him like a mysterious ball. It would burst and blow up Mr. Free's poor frame. Mr. Free kept quiet.

Mr. Critic availed the opportunity. At once he put forth his copy and said:

"Will you please see this piece of writing? It is original, flawless and expository."

"Oh! It is about the New Year. You are the fifty-first writer who

once again tried to breathe life into the dead metaphors of some old writer. Hackneyed, stereotyped, jaded, beaten-out, dead ! Cliches of of word and phrase. Better call you Mr. Cliche than Mr. Critic !"

Mr. Critic turned white and black, pale and yellow. He hid his face.

Mr. Free poured out his eloquence: You are a butcher. A cook ! Mr. Critic, your writings are books of cookery and slaugher. Not literature. I bet. I stake my all masterpieces on my bet. Your whole work can't match a single line of mine." "Will your superfluous majesty try not to hood-wink us ?" Mr. Free held his tongue, and begged me not to expose his weaknesses and foibles.

"I may not excel in prose but I shine in poetry. I give you a spontaneous composition !"

Mr. Free was looking at the petties in the show-case. "Do make a line or two Mr. Free." Mr. Critic had forgotten the rebuff given to him just a little time ago.

"Hot petties fresh from the oven
Dressed in the cabinet to be shown."

I can't compose long verses. Short ones are my favourites. Just consider these.

Fret, fret behind the bars
Bleed, bleed under the cars.

"O you plagiarist. You plagiarise both words and thoughts. A perfect poetaster."

"But what about this ?
Lie Diana to the moon."

Mr. Free tried to proceed further. But he could not. He simply could not. Mr. Bulk came to his help and supplied the missing line.

"Cry Korea in the Noon!"

"Mr. Bulks' wit ! How clever ! Genius Mr. Bulk !" Mr. Smoke as a contribution to the applause, blew a mouthful of dense smoke in Mr. Bulk's face. Water stood in his eyes. He was angry. A cake into the mouth and with it went the anger ! Mr. Smoke extinguished the last bit of his cigarette into the full cup of Mr. Critic. Mr. Critic did not mind. "A falling star cooled into my cup ! I expect a shower of them." Mr. Critic drank the cup with his eyes sparkling with gratitude and content.

Mr. Free stood up in his place and addressed us :

"My parasites ! You kill time as if you were killing flies. I suggest a way to while away the time. Take a piece of paper. Tear it into fine pieces. Write some words on them. And shuffle. Then call everybody by name to pick up the pieces one by one. To whomsoever whatsoever comes, he shall call a spade a spade, keeping in view the statement on the paper."

"My intuition will point him out who beats about the bush. And you know I am a hard task master."

At first we thought that that was foolish but as Mr. Free's proposal could not be turned down, as we feared his dressing us down, we adopted his proposal with an oblig-

ing gesture. Mr. Bulk however objected. Our sweet words tried to bring him round. But he was as adamant as a buffalo resting in a cool puddle in summer. Mr. Bulk panted and flushed. We all were foolish. Mr. Smoke knew how to tackle him. He said: Hello! Mr. Bulk. Open your mouth. He opened. Mr. Smoke filled it with a buiscuit. Mr. Bulk chuckled and giggled. "One should know where the shoe pinches." Mr. Smoke's subtle remark did notoffend him.

I wrote different statements on five pieces of paper. Mr. Free shuffled them up, and ordered us to choose.

"Read your paper aloud. It may concern your life or not. Only explain it honestly."

Mr. Free ordered Mr. Bulk first of all.

"As ashamed as a fat man caught while stealing some sweetmeats from his little son's pocket!" Mr. Bulk read it aloud. All of us burst into seemingly never-ending laughter. Our sides ached. Mr. Smoke could not laugh freely. He coughed. He drank tea and coughed, and coughed, and drank tea. Mr. Critic tried to analyse the statement with intervals of silent chucklings. Mr. Free ordered us to be silent. Mr. Bulk's face got blackened with anger. A sweet tablet was slipped into his palm and he resumed.

"It seems incredible. You have purposely blackened my character. I never stole from my toddlers' pocket. I swear. A curse of fifty-one bulls on me if I were ever caught stealing. Devil take me if....."

Mr. Critic replied Mr. Bulk with an abrupt and awkward laugh.

"Mr. Bulk, you are enormously foolish! Why do you swear? Why on earth you curse yourself? You have no children. Do you have any?"

"Next man!" Mr Free's despotic voice roared. Mr. Smoke tucked down his straying collar, set his loose glasses on the nose, cleared his throat, and in a thoughful mood read out: Don't leave a suicidal note on the table again.

"True! Fearfully true! True to his disposition and nature." Everyone made a noise. "It is queer to think of finishing one's life. It needs courage and will. One can't think of suicide unless some invincible obstacle impedes the smooth journey of life. And then killing oneself also adumberates something of insanity. But mostly suicide is attempted by an extremely sentimental and melancholy man. The problems facing one's life must be as formidable as mountains. Then suicide becomes a must. A quite natural death! You know I am senior to you by one year as far as our academic careers go. I would have been doing my M.A. in psychology this year had I not been detained last year. When I had to go home disappointed I did not like to show my face to any of my relations. I writhed in extreme anguish. I just went to the railway line and waited for the train which was due in half an hour. My past life with all its sunshine swam before my eyes. It pained me to part with my romance. But how could I wait for one year more? I felt like fish out of water. The wheel made of stainless steel

would run over me and lick up my breast surging with shooting pains. I thought myself safe when dead. I saw the train coming. I was in a trance. A chum of mine came from behind, woke me up from my suicidal sleep and stuck a cigarette between my starved lips. I hid my chagrin in dense smoke."

Everyone except Mr. Bulk was sober after listening to Mr. Smoke's tale. Mr. Bulk was chewing a beetle leaf.

Without Mr. Free's order Mr. Critic got up with his piece of paper.

"It is easier said than done." Mr. Critic read the statement and tried to fix it in some aspect of his life. In fact it encompassed his whole life.

"Turn wheresoever thou canst,' this truth shalt stick to thee." Mr. Free tried to upset Mr. Critic.

"Well, "Mr. Critic resumed, "this thought has perpetually obsessed me. I have been criticising my friends' compositions since I made my debut in literary pursuits. I criticise simply because I want to. Please do not condemn me. I disclose my weakness. I inherited it from my parents who are of a very inquisitive nature. Anything my friends write can't escape my censure. One day I wrote something on "Reflections in the Mirror." and showed it to a writer-friend of mine. He praised it very much and assured me about its novelty and suggestiveness. I sent it to an editor of some magazine. The editor sent back the article with the words : "Don't waste your time and energy. Be an apprentice to some carpenter. You can fix a mirror in its frame but you can't read reflections in it." Then I knew the worth of the statement : easier said than done. Anyway it is a good statement ! "

When my turn came I remained sitting in my chair and rolled out the folded paper. I pronounced the statement aloud. It read : What is your conception of love ? It perplexed me. I said : But Mr. Free.....I am unable to....."

"But me no buts. You shall explain or you run the risk of expositions of all your foibles" Mr. Free hushed me. I had to prate a little.

"In fact the topic of love has been taken up by every Tom, Dick or Harry. There are as many explanations as the number of people including those yet unconcevied. Before putting forth my own poor view of love I will like to see it from your point of view."

"Mr. Bulk, I hope, won't mind, if I push out the ghost of love from his passive mind. He would like to see Mr. Donkey and Miss Donkey go a courting in an open field under the sun rather than to see a man playing upon flute and summoning his sweet-heart with music at sun set.Or he wouldddelight inlooking at Mr. Bull excitingly waiting for his Miss Cow, who is swishing her tail in a miry pool, preparing herself for honey-mooning. She thinks herself honey and looks upon her fiance Mr. Bull as moon. They

think themselves heavenly-creatures when they are grazing cheek by jowl. After all they are love-inspired creatures!"

Mr. Critics' love is not an ideal one. Nor he sees love as Mr. Bulk does. He would like to fall in love but he would curse it and himself if it proved sterile. He will always want it to produce an effect theatrical, melodramatic or sublime."

"My views will harmonise with those of Mr. Smoke's if I don't interpret them wrongly. Love! wher ever it is it looks like a desert rose, young, unspoilt and blushing."

"It can brave the might of hurricanes, but it fades out at a simple touch. See it from afar. It is real. Yet it is an illusion if you try to feel its presence. Do not fall in love please!"

"Now Mr. Free's life is full of tragic love scenes. Rose died. Katherine died. Isabella died. Rosetti breathed her last. Sovanville shut her eyes. All died. Mr. Free's eyes burst into founts of tears. Tears ceased. He could not weep. Mr. Rumpy came. Mr. Butky came. Mr. Holy came. Mr. Huppy joined him. All sympathised with him, and asked him to give up grieving. They carry the load of his intense grief and pain. Still he craves for the dead ones. Poor fellow! One day he goes to the grave of Rose with Mr. Rumpy and cries his eyes out. The other day he is in the cemetry with Mr. Butky. Some evening he is seen with Mr. Huppy pulling out nettles from Isabella's grave. God give him no more bereavements!"

Mr. Free got up. He pulled out the handkerchief from my pocket and wiped his two tears, and slipped the handkerchief into his own pocket.

"First, you conspirators! Explain this strange thing. Am I such ill-started man as to receive the worst statement. Does it carry any sense? "Is not a dog unfaithful?" You want to throw dust in my eyes. The are shining jewels, my masters They can espy an eagle on mountain-top. As long as these two shining orbs sparkle, your intrigues can't succeed. I know intrigue is in your blood. A man, by destiny promised dizzy heights of eminence and achievements, is the itching nail in your shoe-soles. I know that not only you are jealous of me but also small urchins look at me with impish smiles, as if I were their newly-wedded father. You are not my next-door neighbours. You are not my widow aunts. I am not a passive bucket. Even your praises are like poisonous shafts. But these shafts will have a boomerang effect. Strike me. Your are shaken!"

"Mr. Free, you have abused us enough. One more syllable from your loose tongue and there comes a volley of blows."

"Excuse my long introduction. Now I come to 'Is not a dog unfaithful?' You think you have stuck me in the horns of dilemma by confronting my genious with such a statement. You are mistaken. Look how I explain it, and how I illustrate my answer with examples. Just wait!"

He whistled and a dog came running towards him, wagging its tail. It licked Mr. Free's boots. Perhaps every dog was his friend. Mr. Free threw the whole loaf of his share before the dog. The dog picked it up and began to eat it.

"Will you give me half of it ?" said Mr. Free. The dog nodded its head. Mr. Free tried to snatch the loaf from its jaws. It turned its mouth. But it brushed its tail against his hands.

"Look ! the silly thing was hungry. I gave it my bread. I asked for half of that. Just one half. Instead of promising me bread it slipped its tail into my hands."

"A turn-coat. You are not a man, dog ! A man at least hides his hypocrycy. But you are an open hypocrite. Do you think me an utter fool to give you anything in future ?" Here the dog barked. Perhaps it mocked at Mr. Free's poor knowledge of dogs.

"Mr. Free you are right. Perfectly right. None is here who can question your authority on... !" Mr. Critic puffed up Mr. Free.

"Thank you all !" He took his seat.

"Quizes, quizes please !" Mr. Free sprang to his feet.

"What is a quiz ?"

"I tell you : it is something which puzzles you ; which you can't easily solve. I give one. You solve. A very trite thing that clings to everything in the universe. Name it !"

"It is a cake !" cried Mr. Bulk, as if he were promised one.

"It is air !" answered Mr. Smoke.

"Does it exist in cake ?" Mr. Bulk knitted his brows.

"It does. A cake has pores. When you eat it air slips out." Mr. Smoke seemed to have solved the riddle.

"But does it exist in the extinct ashen bones of your great ancestors" personal clown ?" Mr. Free cut him to the quick.

'Or did it exist in the foot-nail of your favourite parrot eaten by the neighbour's cat ? Mr. Critic silenced Mr. Smoke completely.

"You can't solve it."

Mr. Free was proud of the inexplicability of the quiz.

"Mr. Free, we can't solve it. Poor minds. Will you help us out ?"

"Yes, yes. Of course. What on earth I am for ? Just wait. See how my genius works. It is heated. My mind is functioning at white heat ! Got it. It is a straight line !" Mr. Free could not contain himself with joy.

"Apply the solution on microscopic bacteria" Mr. Critic wanted to repudiate it.

"Then the straight line would also be microscopic!" Mr. Free retorted.

"But a pastry does not partake of the shape of a straight line!" Mr. Bulk's mouth dropped some saliva. "I can't buy you a pastry here" I disappointed him.

"How would you make a straight line cling to moon-light?" Mr. Smoke was looking outside.

"Befooled, fooled! It is name! Name clings to all. God has hundred and one names." Mr. Free unfolded the secret and jumped out of the room. We followed suit. Mr. Free was running. Everybody ran after him. Khan Mir was calling us. By the mond Mr. Smoke panted, and sang:

"But here there is no light, save what from heaven is with the breezes blown."

"Don't sing! Take out money".

"Look at the poor cold stricken dog. He craves for the moon. Silly!"

"Search your pockets."
"Where is Mr Bulk?"
"Paying the bill!"
"Let us run away!"
"Wait for him."
"He is coming."
"I stole one pastry, after all!"
"Hush! no more."
"We are men again!"

Notes On Coleridge's Supernaturalism

by
SAEED AKHTAR
IV Year

Shelley says, "Coleridge was a muddled-brain metaphysician, who by some strange freak of fortune turned out a few real poems amongst the dreary flood of insanity which was his wont. It is these real poems only which must be selected, or we burden the world with another useless book... There is no difficulty in making the selection - the difference between his poetry and his driead is so striking."

When the first sight of romanticism appeared in 18th century supernatural theme was seen as outworn. It received new prominence and life during this period. It was a result of a flood of novels about ghosts and witches. Literature broke away from cold dominance of reason and logic of classical theme. Now the authors of these gothic novels have been forgotten and thrown in oblivion. They wanted to make our flesh creep and create horror and terror and in this way they wanted us to believe in supernatural beings. The result must be admitted was not a very impressive one. Instead of creating real horror and terror in adult mind their attempts seem quite silly and infantile.

Romantics were trying to explore the spheres which classical anthors had not touched. The literature created by the supernaturalists failed because of the handling of the theme. They did not know how to deal with the theme. Supernatural can create an effect only if handled properly.

Shakespeare had handled supernatural with a great degree of success. He did not make supernatural a prominent thing in his writings but on the other hand made it a subordinate feature. But these authors had overemphasised the thing. They concentrated upon it too much to the exclusion of almost everything else. This spoiled the beauty and the strangeness of their subject.

But the modern authors do not believe in the supernatural as the ancient authors do. Homer and his followers did believe in this and therefore their writings are convincing. But the writings of those who do not really believe in it are unconvincing. Supernatural is not a reality for them but an indulgence and fancy.

It meant nothing to Blake and Wordsworth. But to Coleridge

supernatural was a part and parcel of a man's life. In 1797 when he was 25 he found all the scope of his genius. We see that the outburst of his creation lasted for two years and he wrote Kubla *Khan*, *Christable* and *Ancient Mariner*. The poems preceding and coming after these poems are also excellent ones. But we see that in these two years he wrote these three poems which no one else could have writen.

The dreamer was now able to give concrete form to his thoughts and dreams. Kubla Khan is less directly concerned with supernaturalism. But even then we can see that supernaturalism has poked its nose in this poem to some extent. Therefore we can say that even in Kubla Khan supernatural penetrates.

He took supernatural as his subject and was a success. He must have had to face certain difficulties because in the view of the critics this theme was an outmoded one. Even Hazlitt says, "It is high German." He was against anything un-English. About *Ancient Mariner* he says, "in it he (Coleridge) seems to conceive poetry but as a drunkard's dream, reckless and creedless."

Let us hear the views of Charles Lamb (comparatively) a sympathetic critic) : 'I dislike all the miraculous part of it (Mariner's) "He dislikes the use of supernaturalism but inspite of it he likes the poem because Coleridge has very successfully portrayed the feelings of the man under discussion

Coleridge set himself to a difficult task. To succeed in it he must do great deal more than what the writers of Gothic novels did and must produce something new which should be in its way compelling and humane. He was aware of this difficulty and he did overcome it. Ancient Mariner's effect is not that of an ordinary ghost story. He achieved something more complex than a mere thrill of horror. The story of *Ancient Mariner* presents an incredible series of events through such a method of narration that not only it appears convincing but also a running commentary upon life. Its glory is that it presents a chain of impossible events in such a way that they seem possible and critical of a man's life. When we calmly think about those events they seem quite impossible but the way in which he presents them makes the events appear and connected with life. No other poet had done such a thing on such a thing on such as large scale.

He evokes thrills of horror in his opening verses; they have great many things in common with the literature about ghosts. But he widened his scope and created much more richer literature which was much more closely connected with human life.

First difference between the Rime of the Ancient Mariner and other horrific literature which we note is the difference in the setting of the story. Coleridge did use and set his story in medieval castles as in the story of Christable —the only instance in his poetry. Mariner's

in daytime at wide open sea and in soft nights lit by stars. The new setting and new person with which Coleridge shapes the story gives it a new character. Instead of confining his story to outworn places he moves over wide range of human emotions. The only human feeling depicted by Gothic novels is the dread created by ghosts. He moves over a very wide range of human emotions and he equally touches upon the guilty soul, its suffering and its relief from it. Hatred and forgiveness and other feelings have been dealt with in a masterly manner. This is a marked difference between his writings and those of earlier age. None of his writings has misty dimness. His creations are very clear and sharply outlined. What he imagines is fantastic but what he depicts with a sharp vision is alive before our eyes quite vividly.

Homer and his contemporaries faced no difficulty because ghosts were strongly believed in by the pepole of those times. But Coleridge had to present supernatural before those whe did not believe in such things. Therefore to make them feel comfortable he must for the time being at least make his audience believe in that what he presents. The method he adopted was that he related something which was already understood, which touched their imagination and to achieve this he exploited some of the characteristics of dreams. By giving his work a dreamlike quality he could give them something with which they were familiar.

Sometimes our dreams are more vivid than our waking impressions because critical sense at that time is not at work. The effect of dream is more powerful and haunting. They have power of stirring our emotions.

Now let us turn to Ancient mariner. Its story shows many qualities of dreams. The scene moves in abrupt stages and each of these has its own dominant character as dreams usually have. Its visual impressions are brilliant and absorbing and its emotional impact changes rapidly. Fear and desire come in a very unusual manner and force.

The emotional impact of dreams keeps on varying. The memory of the poem clings to the memory reader with the same tenacity of dream.

Coleridge gives to his poems its own rules, its own atmosphere and its own coherence. Things move, of course, in mysterious way but not without some connecting link which might be called to have caused the event. When the mariner shoots Albatross he suffers punishment and he carries the agony of the memory to the last days of his life. But it can be said that killing of Albatross is not a big fault.

The punishment is logical one because the bird brought good wind and because it is admitted that killing of the bird was aimless and frivolous. Once we accept the assumption that it is wrong to kill Albatross the rest of the events follow necessarily. It is true that it is hard to accept the assumptions, but at least Wordsworth should not have objected to it because he himself had suggested the idea.

This imaginary world has its own rules which are somewhat different from our rules. In such a world which Coleridge has created things should happen as things do happen. It is not difficult to believe for a moment that spirits can watch over human affairs. When we once accept this it is right for them (spirits) to interfere in human affairs as a consequence.

The mariner relates and makes them close to our emotions and makes them more coherent. Of course that world is different but not so unfamiliar; therefore we can say that it is not a "drunkard's dream." Coleridge succeeds in weaving a web and we are lost in it and it is the result of conscious effort on his part.

Why? Because each action and each situation is represented in a concrete form without any vagueness and details of the situation are selected to appeal to common feelings and experience. Presentation is quite clear and vivid. The details are within the scope of our daily life therefore we forget the general unnaturalness of the events.

"His ship moved by spirits," looks fantastic but not absolutely strange as presented in gothic novels. Once we have entered imaginary world we are not surprised by anything.

He takes pains to see that the things he is preseting should be familiar to eyes and ears. The men, the ship, the bird, the snakes, every thing has been presented and painted vividly. They as forcibly clear to us as anything else. The background against which he shows them is quite clear and natural. It could be done only by a man who bad studied nature, very keenly. Nature remains as it is. In midst of unnatural nature events remain always natural. The rising of sun, the ice and beauty of stars have always been presented in a natural way. The condition of the mariner changes but nature follows its usual course. Even when nature becomes violent it is still being itself. "The upper air bursts into life." He pictures thunderstorm over the sea in a quite natural way. In such scenes everything comes from the known-world. Everything of the background comes in a very realistic, correct and natural way.

The realistic treatment of the setting is matched by the appeal which Coleridge makes to our feelings and emotions in dealing with human character. The mariner and his comrades represent types and not individuals therefore, those feelings are universal and that is why we respond so quickly to their pathos and miseries. For example helpless agony of thirst is not something which may leave us unaffected. The treatment of emotions is the salient feature of Coleridge's poetry. People in the *Ancient Mariner* are not characters, they are more or less types and that is why that happens to us. He depicts skilfully the woeful agony of thirst. In this way he stirs our emotions. When at last the rain comes he shows relief and this thing gives us satisfaction as if we had quenched our thirst after a long drought. He has done it with a striking economy of words :

My lips were wet, my throat was cold,

My garments all were dank ;

Sure I had drunken in my dreams,

And still my body drank.

He has sceeded in telling us the wonderful relief of thirst in simple words. This is a physical sensation of man. The mariner passed through so strange an ordeal that to relate it is quite a job. It is still more hard to rise to such occasions and give us a demonstration and make the fantastic things look real and then to concentrate on the elemantry feelings of men. The mariner is in a pitiful condition, alone, surrounded by the dead bodies of his friends on wide sea. Coleridge conveys the full significance of the plight in which the mariner is placed. Our attention has been drawn to this desolation :

Alone, alone, all all alone,

Alone on a wide, wide sea.

T h e s e things give moreover emotions. Loneliness is the real anguish of a man who feels himself abondoned by God and men and is tortured by his own quality conscious.

Coleridge can do justice to happy moments also. When the ship comes to shore the mariner sees angels besides dead bodies and he feels an immense relief and the very silence of heavenly bodies fills him with joy. A great relief comes to the tormented soul and this contrast gives him a great joy after much helplessness.

Coleridge understood the relation and distance between joy and despair and this thing as a consequence depicts the variation of lights and shadows of life in his poem.

The paradoxical voyage from known to unknown world is introduced with delightful verses :

"The fair breeze blew, the whste foam flew,

The furrow followed free :

We were the first that ever burst,

Into the silent sea."

When the death of Albatross begins to be avenged the face of sea is changed :

"The very deep did rot : O Christ !

That ever this should be !

Yea, slimy things did crawl with legs.

Upon the slimy sea.'

This description has right degree of exactness for the thing because if it had been more detailed the horror of the slimy things would have been decreased.

Sometimes he goes beyond fantacy and illusion and calls somethings which is deep down in our hearts.

'He prayeth best, who loveth best,
All things both great and small;
For the dear God who loveth us,

He made and loveth.'

These lines call for something serious and sincere from our hearts. Inspite of subject being fantastic it has something which effects our deep feeling.

Than another question comes that why bother about killing the bird ? But the story involves great differences of right and wrong. Through his concrete story he reaches much more wider issues. His presentation of the subject is symbolic and with its hepl (world of absolute value). This thing forces us to look at them from a new and enlightened point of view. It disassociates idea from the association of idea and present it in a very novel way. The story of the ancient Mariner drew our attention to the neglected truths and this he thought was the purpose of poetry.

His poem is enjoyable for being well told story and secondly that it is a myth of dark and troubling crisis which has come to a human soul. To use the familiar technical language it is a story of crime and punishment. In each section what count is emotional impression of the words of the poet. Now let us take the poem 'The ancient Mariner' from section to section.

I. In this section the poet tells us about actual crime. To us the shooting of bird may seem ordinary But Colerigy tells us about the importance of the thing by giving reasons.

(i) Why was the bird killed ? He does not say this. We might gues he did it in a mood of annoyance ; but these are merely guesses. Coleridge does not give us reason and this thing illustrates the uncertainty of the crime. He makes the killing of the bird irrational and unreasonable.

(ii) This crime is against nature But how ? It is against the sentified relation of host and guest. The bird which had been hailed in the name of God should have never been killed :

'As if it had been a Christian soul.'

Coleridge seems obsessed by the idea of brotherhood. The Mariner breaks the oath. The crime of the Mariner does not stand isolated but on the other hand it stands as a symbol of irrational crimes done in this world against the ordered system of nature.

2. In the section the Mariner begins to suffer punishment for what he has done. Coleridge transfers to the physical world the corruptions which are associated with crime. The ship has stopped moving and sailors are tortured by thirst. The only moving things are slimy creatures and death fire dancing.

3. Guilty soul becomes conscious of what one has done He was suffering the punishment but did not know the reason of the punishment. When he comes to know of this he suffers isolation. The night in which the companions of the Mariner die it symbolises the darkness of the soul and this thing leaves the Mariner alone and as a result he is robbed of all familiar ties.

4. The guilty soul is not only cut off human relation but it is also robbed of the sympathies of fellow-men. Then a turn comes for the better after isolation. The Mariner though unaware ; blesses the water snakes :

'I blessed them unaware.'

He begins the process of rehabilitation and reestablishes relations with the world of effections. This is not the end of his troubles.

5. The process of rehabilitation of the soul continues. The ship breaks its monotony and begins to move. The celestial creatures come down and stand by the dead bodies. The Mariner hears heavenly song.

When the music of heaven flows into soul and when it delights him we see that he is on his way back to the revival of his soul. But he has still to do a lot of repentence.

6. He is ready to undergo penance. The process of healing of soul seems to be hindered. The Mariner is haunted by the presence of his dead comrades and feels that some fiendish soul is still haunting him.

In this way Coleridge gives us the figure of the Mariner haunted by fear after crime as a symbol of remorse after the committance of crime. He is forgiven when he sees angelic bodies.

7. The end of the story comes. The Mariner has been restored. Since he has committed a hideous act he would never be the man he was. Because crime leaves something which can not be removed. The memory of what he has done is so insistent that he must speak of it :

Since then, at an uncertain, hour,
That agony returns :
And till my ghastly tale is told,
My heart within we burns.

The poem is roughly a myth of guilty soul from crime to punishment and then to remorse and repentence.

SOCIAL REFORMS

BY

RAFIQ AHMAD AKHTAR

III YEAR

SALUTATIONS to our worthy President F. M. Muhammad Ayub Khan and his military colleagues who have rid the country of its manifold evils. Though the real change in the hearts of the people and their actions comes with the fear of God to which every one of us should aspire and try to find out the way for it, the establishment of the revolutionary regime, it would appear, has brought about a salutary change all over. In this there is ample food for thought for the miscreants, to fear the Day of Judgement and reform themselves.

The condition of the poor man is far from satisfactory and one can hardly say, he gets two square meals a day, as the profiteers are preying upon him by one means or the other.

The prices of even the bare necessities of life *viz.*, wheat, ghee, meat, vegetables etc., are beyond his reach. There is no earthly reason why the prices of indigenous articles should not be brought to pre-war level. Unless this is done, the poor and the middle classes are bound to suffer. Big industrialists and Zamindars, who are rolling in money in every way by the exhorbitant prices of their produce, are sure to resist this ; but they should as far as possible, climb down to afford equal opportunities of life to the have-nots, otherwise, why talk of Islamic Fraternity and Equality if they cannot be put into actual practice ? After equal opportunities are provided for every one, if anybody scores a victory over the other by sheer dint of hard labour and ingenuity, nobody should grudge him, and this is allowed in Islam. By this scheme of things generally, an ideal state of Islamic society will evolve, and exceptions to this will be few and far between.

Let us start a drive of using locally made things and gradually we can make our own industrial machines and agricultural implements. By and by the scare of foreign exchange will be eliminated. Even now the prices of commodities are far higher than any exchange will allow. It is only the question of fixing the prices low with a ruthless hand keeping up to them. Why should we copy the rest of the world when we have miserably

failed to improve the living standard of the common man ?

The austerity move in luxury goods, cosmetics etc., made by our sisters is highly commendable.

Let our people realize that the bestowing of Pakistan on them is God's sheer bounty. They made no voluntary sacrifices for it. The holocaust of 1947 was a retribution for their unpreparedness and lack of training and discipline for the coming storm.

So, they always should be before Him, for His Bounty and discharge their duties towards one another honestly, diligently and humbly, rather than get swollen-headed, irritable, corrupt and lazy.

After the termination of the military regime, it is feared that the former chaotic conditions will raise their hydra-heads in the country again, this is not a speculation but a fact. To obviate this, it is suggested, that all civilian officers and employees (infact every civilian for a lesser period) should undergo military training in a college set up for the purpose for a couple of years with actual field-practice as for Army Officers and Personnel. After this refresher courses should be held annually. This will surely go a long way to gear up the whole thing more or less on a permanent basis.

As a matter of fact, it is only the Government pledged to the ideals of Islamic society which can cleanse the Augean Stable—as it is now all over the Islamic world. The people must co-operate with the Government fully and reform themselves to make the enterprise a complete success. If they themselves have utterly failed to set their domestic and social affairs in order, the Government, perforce, has to come to their aid, it is no interference in their private affairs and it will certainly not be the negation of democratic principles. Otherwise, it is bound to affect the whole set up and lead to entire bankruptcy. One can easily realize the hopeless condition of our homes and society. The Government has, therefore, eventulaly to deem it fit to close down all modern cinemas, theatres, night clubs, gambling dens, wine-shops, musical concerts, singing, radios, dancing-halls etc. etc., as forbidden by Islam and put sentries on the road, and in the mohallas at respectable distances and appoint lady visitors for the homes to advise on and check any unsavoury thing going on there. The sluggish, medicants, corrupts, day-dreamers and day-sleepers, have therefore to be on their guard. Only by these means coupled with voluntry self purification can we usher in that era of piety and rectitude which was the hall-mark of our fore-fathers especially in the Golden Age of the Holy Prophet and Khilafati Rashada.

ON READING

BY
HAMID AHMAD KHAN
II YEAR

WEATHER was fine. A cold, damp, light wind was blowing ; the sky was cloudy and now and then a shower fell down ; leaves of Euclyptus in the compound produced shrill but low sound, while the tiny foliage were dancing ; birds dared not come and fly in the blue sky ; it was too cold. The grey, nearby hillocks were isolated and calm ; no wild beast came out of its winter-resort. But some little ones of the 'best of all creatures' were playing together on the bare, cold, hard and slippery ground to prove, by facing the chilly morning that, they belonged to the best of all beings. They were fully absorbed in their childish play that did not make any sense to an adult. They made little, tiny houses of clay and then with a loud burst of laughter levelled them again with the soil. Once again their small pink hands and feet became blue ; their faces were red like rose and cold like snow, they went on playing inspite of the inclement weather Newton could not resist the heat of burning fire beside him and called his servant to put it out, but these jolly, little, young fellows outdid Newton in the matter of absorption.

I was looking all the while from the window of my attic, where in an atmosphere of complete isolation and silence I pretended to read. The fine and lovely weather and the little innocent children playing below had such an attraction for me and an invitation to enjoy nature in this sparsely populated part of the country, that without turning even for a moment to my big, open volumes at the table, I came down covering myself with a blanket.

I upbraided, reproached and reproved my newly-bought, fine, shining watch when I came back from my stroll, as it, so I did think, had gone very fast to claim that it was 12, o'clock. Lost in reveries; I had travelled a long distance in the green fields and beholding some species of plants covering my botanical course wasted a lot of time over them. I wonder to hear some of the seemingly sensible chaps say they find to spend their time alone as difficult as bearing zoological names and terms.

I had my lunch. They say when a camel is infuriated, he finds out his enemy from even the depths of

the earth and follows him to the last. But I was, perhaps more determined to stick to my books, come what may, to the late hours of the night and have the chapter I began the other day, finished. I found my speed of reading quite fair, my attention undivided and in the short span of one hour I had gone through a lot. My joy knew no bounds ; I was in the seventh heaven of my delight. But what was next to come, I could not even think of it. An inevitable violent blow, which neither I did nor I could resist, awaited my studies !

" When climatic variations are of a pronounced nature . . . . . " The sentence was never finished. My door was knocked at by some energetic, strong and sturdy hand. Willy nilly I came down. The peon of the college was standing at the foot of my door. Without delay, he gave me an envelope and went off. It was from the Principal. He was gracious to choose me among those who were to receive some renowned men from the University. I had to change and hurry up to his office.

The evening was as fine and pleasant as the morning. It was more so, for whenever the clouds that hid the sight let the graceful King Sol cleared away, a golden sheet covered all the world over. I had no intention to play. But excited voices of my jolly friends made me uneasy. Soon out I was in the playground, unconscious of my annual examination !

" Winter nights are longer than days ", lured I myself, " I would make amends for my negligence towards my studies ". A long walk and a good game made me dead tired. My eyes were heavy ; the head was giddy ; every muscle of the body was tried ; the poor, thin, weak legs were aching, I was completely unfit to continue my reading. I tried all sorts of strategems, washing my face with cold water and counting the stars on the sky outside. But a spent-force must yield ; falsehood must be revealed ; and truth cannot be concealed. Before long, I was asleep. When I rose the next morning, the bright sun was coming up from behind the eastern hills !

To

The Editor 'Almanar'

Sir,

I crave the hospitality of your columns by sending this VERY INTERESTING ARTICLE.

'MULTIPLICATION BY FINGERS'

From the earliest days of the race men have been counting on their hands. Some Indian tribes in South and Central America have made use not only of their fingers, but their toes, too, giving base to the system of numeration on the base of 20. In English we have a special name for twenty - "SCORE"

Few, however, suspect that our fingers may be handy not only for counting but for MULTIPILCATION as well. Not all multiplications can be performed by fingers, but some, such as by nine, are easily handled.

Here is the multiplication table by '9' :

tens units

1×9 : 9 and 0+9=9
2×9 : 18 ,, 1+8=9
3×9 : 27 ,, 2+7=9
4×9 : 36 ,, 3+6=9 and so on.
5×9 : 45 ,, 4+5=9

We also observe that in each product the numbers of the tens (دهائيان) is less by one than the number multiplied by '9'. For example in '9×2 : 18', '1' less by one than '2'. Now we have a clue as how to multiply by '9' by means of our ten fingers.

Suppose that we want the product 4×9. Place the hands on a table with the fingers flat. Now bend in the fourth finger of the left hand; then to the left of the bent finger we have 3 finger and to it's right 6 fingers and the product is 36 as shown below.

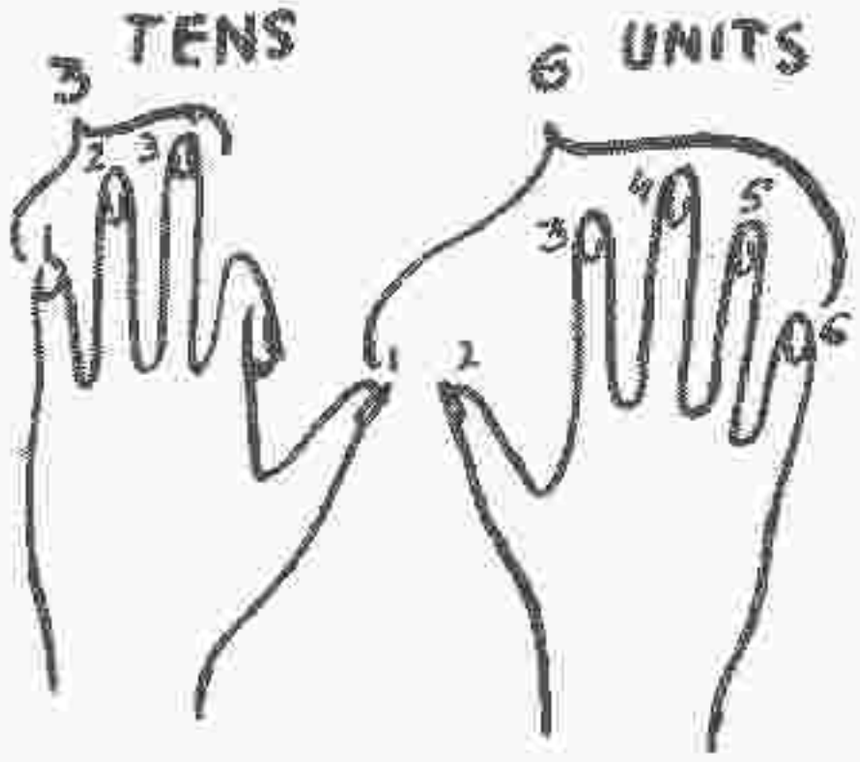

$4 \times 9 : 36$

We cannot in this way find the product of 11×9, but it is found more easily mentally.

Now, let us write the numbers from 12 to 20 by 9.

$12 \times 9 = 108$ and $1+0+8=9$

$13 \times 9 = 117$,, $1+1+7=9$ and so on.

$14 \times 9 = 126$,, $1+2+6=9$

We observe that each product in this case gives only (1 hundred and the sum of TENS) (دھائیاں) and UNITS (اکائیاں) is always '8'. For example in $15 \times 9 = 135$' we have one hundred and the sum of '3' and '5' is 8. Suppose we wish to obtain the product of 16×9. We bend the sixth finger (the thumb of the right hand). This leaves open 5 fingers on the left hand and four on the right. Since the product of 16×9 has it's first digit one (1), we allow one finger on the left for this digit. Thus we are left with four fingers on the left and four fingers on the right. The product then is 144 as shown below.

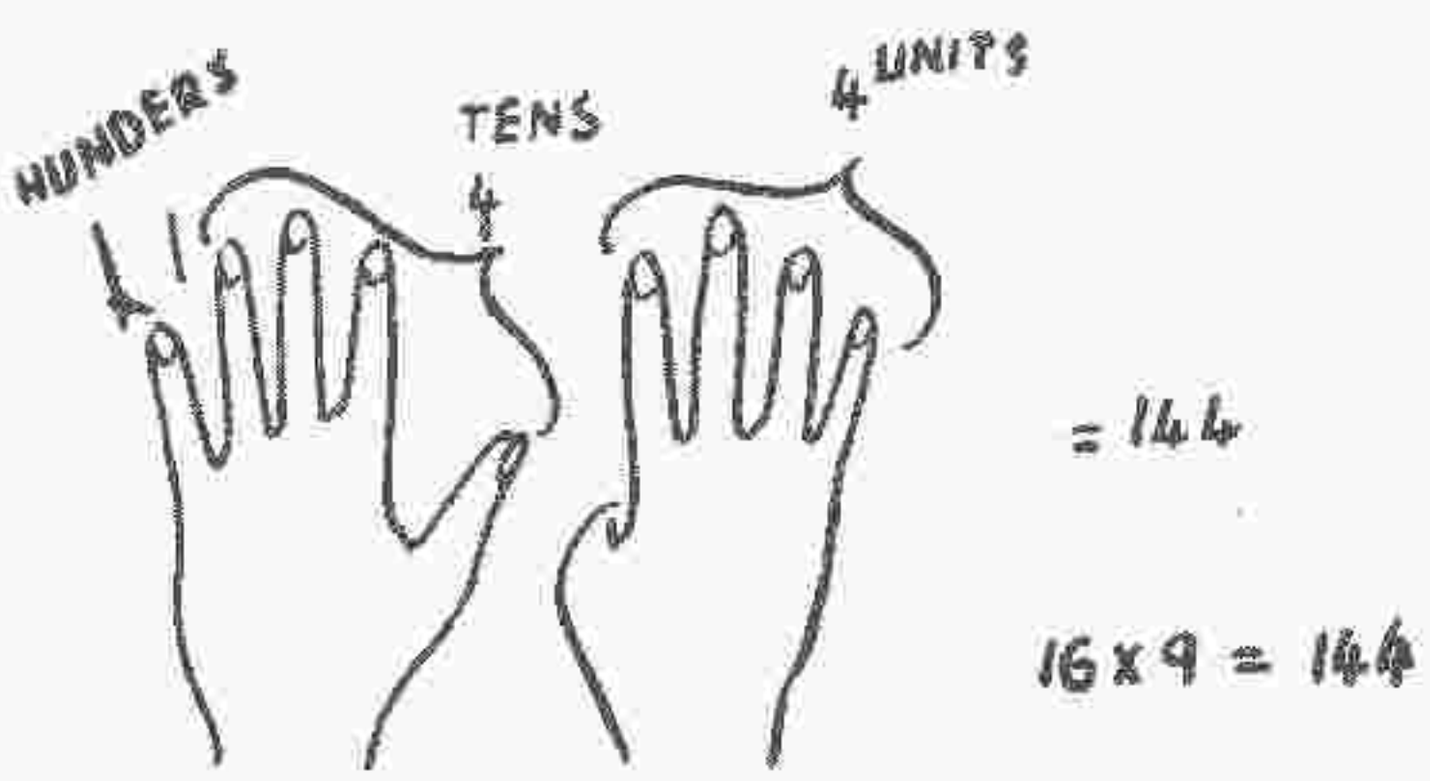

Resurgent Africa

by

MAHMOUD S. CONTEH

AFRICA is perhaps the most misrepresented and misunderstood continent of the world. Her people have been regarded as "savages", barbarious, "uncivilised" etc. And even Africa has been termed as the "Dark Continent," uninhabitable and incongenial to human existence.

What are the foundations and reasons behind this out burst of inimical comments? Who are responsible for, and what do they stand to gain from them?

Some of the earliest Europeans to visit Africa were the Christian Missionaries whose sole purpose was to bring the indigenous people to the fold of Christianity. These Missionaries traversed the African continent and had extensive survey of its land and people—searching for any sign of fertility for planting the Christian Doctrine. But this was not an easy task for them. The African culture, his way of life, his convictions and aspirations had to be proved wrong both in his home and abroad. Hence forward everything that was African or for that matter, savoured non-European was regarded as barbaric, uncivilised or pagan.

The success of this indoctrination led these sturdy propagandists of the Christian faith to report to their respective governments. And as more reports were sent out more champions of Christianity came, hence more and more Africans were converted.

The next stream of arrivals, was that of the traders and settlers. These were followed by their home governments who came to protect the missionaries, traders and settlers, and to "civilize the African" the seemingly perpetual and infamous struggle between black and white had already planted its notorious roots on the African soil; for this was the beginning of a long period of economic and social exploitation.

The "scramble" for Africa was on foot. From this time on Africa has been child of the white master who must needs he controlled, defended, civilised, and directed. Henceforth the gripping, relentless and pitiless hand of colonialism was fast round the neck of the African, Africa was then partitioned. New and different modes of life were ejected into her society.

This roused the national sentiments of the Yorubus, and Ebos and the Fulanis of Nigeria; the Ashantis and Fantis of Ghana; the Temenes and Mendes of Sierra Leone, the He, and Kamba, etc., of Kenya the Mashona etc. of Gentral Africa; and no less than one millon Africans were, in a period of two

decades, killed by the Belgians in Congo. In short, there were riotings and bloodshed evarywhere.

This struggle against foreign domination gained for Africa the notirious names of "barbarians," "uncivilised," "uncultured" and the "Dark" continent," which must be shown the Christian way of life, law and order.

In short this background from which Africa has comparatively recently emerged. This tumultous and rising Africa is calling for immediate and increased attention. 170,000,000 people live in Africa South of the Sahara. Rich in resources, just begun to be explored, this new Africa faces a challenge in the realisation of her dreams.

The tropical diseases, technical and liberal educational, political, economic and social problems untrained labour and lack of sufficient capital, are the major problems of Africa.

In this issue I shall attempt to discuss the political and some of the social aspirations of Africa.

What are the political aspirations of the African? They are the urge to create a national entity and the prerogative to self-government. Africans, like all other peoples, aspire to govern themselves to rule or misrule themselves. It is the urge toward the African personality. This dynamic force of nationalism is the dominant characteristic of the African of today.

This force can be discerned in the following categories.

There are first of all Eurpeans in the Union of South Africa who wish to preserve European domination over the indigenous Africans. This policy of the South African Government is based on the assumption that all "coloured" peoples (Non-Europeans) are inferior to the white. Hence the Boers (particularly Dr. Malan) and the Boer Church staunchly advocated compiete seggation of races or apartheid the African, they say, was made to cut wood and draw water for the white. He can neither think for himself. Hence he must be where he is.

The supporters of this view have failed to appreciate the progress made by Africans in independent Liberia.

When Ghana got her independence in 1957, many white expected her failure. Because of the deportation of undesirable and dangerous elements from the country, many trumpeted that "Democracy has been trampled." They claimed that Democracy has failed in Africa. Yet these advocates of Western democracy forget the British actions in British colonies. Mr. Jomo Kenyatta was not only imprisoned but also exiled from his country for political activities and aspirations. Dr. Hasting Banda is the victim of false charges. In like manner, the Congolese leader, Mr. Patrice Iusuumba, head of the M. N. C (National Congolese Movement) was imprisoned by the imperialists of Belgium Congo.

It is a strange anomolly that these very people who believe in the incapability of the African to learn, think and rule him expect him to practice foreign ideas that were brought to him at the point of the gun.

Besides, Chana has not only survived the machanistaion of the stooges of the imperealists but has also made tremendious progress in every sphere of life. The Five Year Plan provides for nearly 600 factories, more schools, technical colleges, a university, hospitals, etc.

This fact is in itself sufficient to belieu the believes of Dr. Mallan and his colleagues—the preachers of white supremacy over the black and his incapability to manage his affairs in an organised and systematic way. And it is the very fact that has made the white in South Africa desperate. Not only does he practice of his ill-fated policy in the Union but also in the Trust territoy of South West Africa. This has brought on ti the warath of all civilised and peace-loving nations.

There are those who believe in "directed development towards co-operation." This is the attitude of Belgium. Here, the African political thought has been checked by depriving him of political institutions and places of higher education. It was believen that so long as the economic position of the African was stabilised, his political longing will recede to the background. But events showu that this policy is a total failure. The African cannot by content with economic and social stability while his dignity and personality is at the sweet wili of a foreign power. The days are far gone when the African could be cajoaled and blind folded. The freedom movement that was stirring the continent was bound to show its effect in the Congo. Its effect was felt in January, 1958 and culminated in the recent riots, the arrest of the National leader and finally the Round Table Conference which resulted in the independence of the country in June, 1960.

Then there are the French who advocate "Assimilation and unity with France through the French Community." Of all the problems that African leaders face, this is perhaps the most dangerous, and no doubt a great challenge to African Nationalism and statesmanship.

The French community, unlike the British Common wealth, is a conglomeration of Nations with internal self governments but with certain reservations. All must surrender certain powers lke finance, security and foreign easiness in the Male Federation (Senagal and Soudan) In a recient meeting, P.F.A (Parti Federation African), the leading party that forms the government of the federation, tried to tide the growing demand, for immediate and complete independence, that was brought forward by the Party members. A compromise was reached by which the P.F.A. was to ask for independence if France rejected for a confederation of free and independent member states. The leaders are being urged forward by the mass. They cannot stiffle the legitimate aspirations of their supporters and yet hope to maintain their positions. The forces of the urge is the single-minded aspiration of self determination.

The dilema of the l is,dersta though trying, easy to uneanderse

All about them countries have or are at threshold of independence. Ghana, Guinea and Cammeroon and soon Congo, Somalia, Nigeria, and Sierra-Leone are but the few that have got or about to get independence. Independence "minus" is absolutely contrary to the professed desires of the African.

A community which tacitly admits the incapability of the African to govern himself cannot, in the long run withstand the tide of nationalism.

The stage has been reached where the Africans must be stopped been considered as so many children whose affairs need supervision and guidance. The French community is just another type of impeiralism much more dangerous and of much lasting effects since it embodies all the evils of collosal colonialism and in addition, intellectual slavery. The leaders and the mass of the French community have realised that the community is the first step towards another Algeria. And this realisation has forced them to reconsider their programe.

The British colonialism in Central and British East Africa is for partnership with the Europeans. The British government seeks to impose on the Africans a rule in which the Europeans have the main say. Needless to say that such a system ties those countries to Britain and reduces the African to second class position.

It is claimed that such a system will lead to a multi-racial society, raise the standand of living of the Africans and stimulate foreyn investment. In other words, it brings an orderly and democratic government.

Once again the colonial policy is doomed to fail. And the Africans have again seen through the net that was been cast over them. The British government without regards for African interest gave self government to South Rhodesia—to a handful of whites. The result was the abominable racial segregation.

Thus the policy of guiding the colonies to independence is impossible where British interests are concerned. Where the Europeans are in sizeable number the policy is to transfer the government to them. Infact, if the Europeans are, as they claim, Africans, why do they fear democratic principles which they are at pains to see Ghana and other African countries practice? Why do they fear the very idea of democratic government in their respective territories? The phrase, "adult suffrage, one man one vote" is too democratic to be accepted by them.

The partnership has failed. The British government in 1910 handed over the government of South Africa to a few Europeans. The ultimate consequence of this neglect of African interests is the hated apartheid. The same forces are working in self governing Rhodesia, where the Europeans are in power. It is thus that whereever, white interests are in direct conflict with the local interests, the trend is towards white sympathy.

Thus the African has come to regard the white with suspicion and distrust. He no longer trusts him because the white has, in most cases, betrayed the trust placed in him. His suspicion is based on the experience that the white is always planning for his humilation, indignity and suppression.

For these reasons and the undeniable right to freedom, justice and human dignity the Africans ask "Africa for Africans," which is just another way of saying that in Africa, the African, must rule himself. This is because no people under foreign domination will have that respect and dignity which free soveriegn peoples enjoy.

"*Who's that man ?*" - A riddle.

by Jaafar Msolomi.

Brothers nor sisters have I none,
But that man's father's my father's son

Answer page 43

Answer to the Riddle :—
That man is myself as I am looking at my image through a mirror. What do you think ?